سہ ماہی

کاروانِ ادب

(جنوری تا جون ۲۰۱۲ء)

جلد-۱۸، شمارہ-۴-و-جلد-۱۹، شمارہ-۱

مجلس مشاورت

☆ مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ

☆ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ

☆ مولانا حافظ فضل الرحیم

☆ ڈاکٹر محمود الحسن عارف

☆ مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

☆ مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ

☆ ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

☆ ڈاکٹر شفیق احمد ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

☆ ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی

معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۸۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۱۵۰ روپے

پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر

ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

فہرست مضامین

منزل بہ منزل	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
علمی مقالات		
حمد/نعت	حسنین سائر، دہلی	۴
مصطفیٰ علی اثیر: ایک تعارف	مولانا سید ضیاء الحسن	۵
شعروادب		
دعائے شام وسحر	مصطفیٰ علی اثیر	۱۰
غزل	مصطفیٰ علی اثیر	۱۰
پٹنہ میں اردو ادب میں قصہ نگاری کے موضوع پر منعقد سیمینار کے منتخب مضامین		
خطبۂ صدارت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۱
سکریٹری رپورٹ	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی	۱۴
اسلامی قصہ: مقصدیت اور فنی حسن...	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۹
اردو میں قصہ نگاری۔ اسلامی ادب...	مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی	۳۰
اسلامی ادب میں قصہ نگاری کی روایت	ڈاکٹر شکیل اختر	۳۵
اردو زبان میں قصہ نگاری کی روایت	ڈاکٹر ارمان نجمی	۴۰
اسلامی ادب میں قصہ نگاری کی رط۔	مولانا محمد بدر الدین فریدی	۴۲
اردو زبان میں قصہ نگاری کی روایت	ڈاکٹر محبوب اقبال	۴۶
اردو زبان میں قصہ نگاری کی روایت	ڈاکٹر نسیم احمد نسیم	۴۸
اردو قصہ نگاری پر عربی کے اثرات	مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی	۵۳
اردو قصے کا ابتدائی اسلوب	ڈاکٹر شہاب الدین اعظمی	۷۰
پریم چند کی تخلیقی عظمت	ڈاکٹر تابش مہدی	۷۹
اردو انشاء پردازی کی مذہبی جڑیں......	ڈاکٹر صفدر امام قادری	۸۳
ادب، قصہ نگاری اور "سانحۂ عظیم"	مولانا محمد اصطفاء الحسن ندوی	۸۷

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

فہرست مضامین

نذیر احمد کے اصلاحی ناول	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	۸۱
قصہ نگاری اور اردو کی قدیم مثنویاں	ڈاکٹر منظر اعجاز	۸۴
اسلامی ادب میں افسانہ نگاری....	مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی	۹۳
اردو میں قصہ نگاری کی روایت	مولانا سجاد احمد ندوی	۹۷
رفتار ادب		
رابطہ ادب اسلامی کے ۳۰ ویں سیمینار کا دعوت نامہ	ادارہ	۹۹
افتتاحية العدد	الشيخ محمد الرابع الحسني الندوي	۱۰۰
القصة باللغة الأردية	الشيخ محمد الرابع الحسني الندوي	۱۰۱
تقرير السكرتير	الشيخ محمد واضح رشيد الحسني الندوي	۱۰۴
القصة الإسلامية: نموذج للجمال الفني و المعنوية	الدكتور سعيد الأعظمي الندوي	۱۱۰
القصة في اللغة الأردية في ضوء الأدب الإسلامي	المفتي محمد ثناء الهدى القاسمي	۱۱۱
الأدب الإسلامي و القصة	الدكتور شكيل أختر	۱۱۲
فن القصة و لغة أردو	الدكتور أرمان نجمي	۱۱۳
فن القصة في الأدب الإسلامي	الشيخ محمد بدر الدين الفريدى	۱۱۳
القصة في الأردية : نشأتها و تطورها	الدكتور محبوب إقبال	۱۱۴
تاريخ القصة باللغة الأردية	الدكتور نسيم أحمد نسيم	۱۱۴
تأثير اللغة العربية في القصة باللغة الأردية	الشيخ أبو الكلام القاسمي الشمسي	۱۱۵
أسلوب القصة الأردية في عهدها الأول	الدكتور شهاب الدين الأعظمي	۱۱۶
مكانة بريم جندر الإنتاجية	الدكتور تابش مهدي	۱۱۶
الأسس الدينية للكتابة الأردية	الدكتور صفدر إمام القادري	۱۱۷
فن القصة و قصائد المثنوي.....	الدكتور منظر إعجاز	۱۱۷
فن القصة و مؤلف "سانحة عظيم"	الشيخ اصطفاء الحسن الندوي	۱۱۸
الروايات الإصلاحية للأستاذ نذير أحمد	الدكتور إعجاز علي أرشد	۱۱۹
القصة في اللغة الأردية	الشيخ سجاد أحمد الندوي	۱۱۹
فن القصة القصيرة في الأدب الإسلامي :...	الشيخ محمد أجمل فاروق الندوي	۱۲۰

اداریہ

منزل بہ منزل

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

الحمد للّٰہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علیٰ خاتم النبیین محمد صلی اللّٰہ علیہ و سلم۔

انسان اپنی عمر کے آغاز کے وقت سے اپنے ماحول اور اپنے حلقہ وطبقہ کے لوگوں کو جیسا دیکھتا ہے، اسی کے مطابق اپنے کو بنالیتا ہے۔ اسی لیے دیہات میں رہنے والا اپنے دیہاتی ہم وطنوں کی طرح ہوجاتا ہے، اور شہر میں رہنے والا شہری ذہن وشہری اندازِ زندگی کو قبول کرلیتا ہے۔ اس بات کو گھریلو سطح پر دیکھیں تو بچہ بالکل غیر شعوری طور پر اپنے باپ وماں اور اپنے گھریلو عزیزوں کے رجحان ومزاج کے لحاظ سے ان کا اثر قبول کرلیتا ہے اور خیالات وطرزِ زندگی میں ان ہی جیسا بن جاتا ہے۔

اس لیے ماحول کو ایک طرح سے انسان کی طبیعت اور ذہن کی تشکیل اور اس کو کسی متعین نوعیت پر ڈھالنے کا ایک ذریعہ سمجھا جانا چاہئے۔ اور یہ بات وقتی طور پر اپنے اپنے عہد میں تو ہوتی ہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو زبان اور کلام کا جو ذریعہ ملا ہے، اس کے توسط سے انسان کو متاثر کرنے کا کام آئندہ نسلوں کے دلوں میں بھی انجام پاتا ہے جس کا بڑا ذریعہ ادبی ذریعہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ مؤثر احوال واعمال کی ادبی انداز میں پیشکش اس کا ذریعہ بنتی ہے جو خاص طور پر اشعار اور افسانہ وناول کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس کام کو ادب وشاعری کے ماہرین برابر انجام دیتے رہے۔ عربوں میں ان کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کے دور میں یہ کام شاعری کے ذریعے انجام پایا، اور بعض بعض اشعار کے ذریعے تو انہوں نے پورے خاندان یا پورے طبقے کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔

نثر کا کلام شعر گوئی کے مقابلے میں آسان ہوتا ہے۔ البتہ اس کو کسی ادبی صنف میں ڈھال کر پیش کیا جائے تو شعری کلام سے کم تاثر والا نہیں ہوتا۔ اور یہ صورت زبانی ادب میں خطابت کے ذریعے اور تمدنی اور تعلیم یافتہ دور میں کچھ مدت سے افسانہ و ناول کے ذریعے انجام پارہی ہے، جس کے اثر سے بڑے اثر انداز ناول اور افسانے ظہور میں آئے اور انہوں نے اپنا اثر ڈالا۔

ادب انسان کی تہذیبی زندگی کی ترجمانی کرتا ہو یا مطلق آزاد اور غیر پابند ہو، انسان کو اپنی مخصوص خصوصیات کی طرف مائل کرتا رہا ہے۔ موجودہ دور میں ناول وافسانوں نے یہ کردار خاص طور پر انجام دیا ہے۔ زبان وبیان کی اس اثر انگیز صفت کو اسلامی خصوصیات کا حامل بنادیا جائے تو ایسے ادب کے ذریعے انسانی خوبیوں کے تعلق سے انسانی معاشرہ کی اچھی خدمت انجام دی جاسکتی ہے، کیونکہ اسلام جس طرح کی تہذیبی زندگی کی طرف متوجہ کرتا ہے اس طرح کی اعلیٰ سیرت سازی کسی دوسرے نقطۂ نظر میں نہیں ہوتی۔

اسی تعلق سے ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے پٹنہ میں حکایاتی وقصہ نگاری صنفِ ادب پر سیمینار رکھا، جس میں اچھے مضامین پیش ہوئے۔ اس سیمینار کی روداد کاروان ادب کے گذشتہ شمارے میں پیش کی جاچکی ہے۔ اب تازہ شمارے میں اس کے منتخب مضامین پیش کیے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین ان کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ☆☆☆

حمد

میں تیری توصیف کر رہا ہوں، نفس نفس ہے خیال تیرا
مگر یہ احساس بھی ہے مجھ کو بیاں ہے یارب محال تیرا
یہ زمزمہ سنج آبشار اور یہ چہچہاتے ہوئے پرندے
یہ بیل بوٹے، یہ گل، یہ کلیاں، روش روش ہے جمال تیرا
مری نگاہوں سے تو نہاں ہے مگر ہیں ہر سو ترے ہی جلوے
''سحر سحر ہے تری تجلی، چمن چمن ہے جمال تیرا''
شجر حجر ہو کہ بحر و بر ہو، تری ہی سطوت کے سب مظاہر
جھلک رہا ہے ہر ایک شے سے جمال تیرا، جلال تیرا
ہر ایک نعمت مجھے عطا کی، ترا تلطف، تری عنایت
تری ہی چشمِ کرم سے آقا بشر بشر ہے نہال تیرا
عیاں ہے ہر شے سے تیری قدرت، ہر ایک شے پر تری حکومت
یہ شرق تیرا، یہ غرب تیرا، جنوب تیرا، شمال تیرا
رحیم ہے تو، کریم ہے تو، سزا جو دی، بے سبب نہیں دی
جو سرکشی میں بہت بڑھے ہیں انھیں پہ ٹوٹا وبال تیرا
بشر سمجھتا ہے کسب اپنا، حسین دھوکے میں مبتلا ہے
زر و جواہر ہیں سب ترے ہی، یہ سارا مال و منال تیرا
جدھر بھی دیکھوں تجھی کو دیکھوں، جہاں بھی جاؤں تجھی کو پاؤں
میں جب بھی سوچوں تو ڈوب جاؤں، حسین سلکِ خیال تیرا
خطا مری بس یہی ہے یارب، اسی لیے ہے زمانہ دشمن
تری زمیں پر میں چاہتا ہوں، نظام بھی ہو بحال تیرا
لرز بھی جاتا ہے خوفِ غیض و غضب سے تیرے، مگر خدایا
تجھی سے امید بھی ہے باندھے یہ سائرِ خوش خیال تیرا

نعت

کتنا بد بخت ہے جو حدِّ وفا سے نکلا
حلقۂ طاعتِ محبوبِ خدا سے نکلا
دل سے کی پیرویِ سرورِ عالم جس نے
رنج سے، خوف سے، کرب اور بلا سے نکلا
چھا گیا دہر پہ سورج کی شعاؤں کی طرح
ان کا پیغام جو مکے کی فضا سے نکلا
اس کے اعمال ہوئے سارے کے سارے غارت
آگے جو صاحبِ تسلیم و رضا سے نکلا
آپ کو یوں تو ابو جہل سمجھتا تھا نبی
پھر بھی ظالم نہ کبھی دامِ انا سے نکلا
سب تھے ہم رنگ جوانانِ عرب مثلِ حنا
رنگ آقا کا الگ رنگِ حنا سے نکلا
عمر بھر پھر نہ ملا سایۂ رحمت اس کو
جو ترے سایۂ گیسوئے دوتا سے نکلا
روشنی پھیلی، جہالت کی چھٹی تاریکی
''رشد کا مہرِ درخشاں جو حرا سے نکلا''
آتشِ غیضِ الٰہی کو بجھا دیتا ہے
قطرۂ اشک اگر خوفِ خدا سے نکلا
عقل سے نکلا نہ تدبیر سے نکلا سائرؔ
جب بھی نکلا ہے مرا کام دعا سے نکلا

حسنین سائرؔ
(اوکھلا، دہلی)

مصطفیٰ علی اثیر ایک تعارف

(1906 - 1987)

سید ضیاء الحسن

سابق لکچرر امیر الدولہ اسلامیہ کالج، لکھنؤ

حضرت امیر مینائی کے شاگردوں میں ایک بزرگ شاعر ممتاز علی آہ گذرے ہیں، وہ اگرچہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے، لیکن ان کی زندگی کا اکثر حصہ بسلسلۂ ملازمت وطن سے باہر دوسرے اضلاع میں گذرا۔ البتہ رٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے امیٹھی ہی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ان کے چار بیٹے تھے اور سبھی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعلی فیض آباد انٹر کالج میں عربی زبان و ادب کے پروفیسر تھے۔ دوسرے صاحبزادے شاہ عبدالوالی ریلوے میں ملازم تھے۔ تیسرے بیٹے شاہ عبدالباری لکھنؤ چیف کورٹ سے منسلک تھے۔ مؤخر الذکر شاعر بھی تھے۔ انہوں نے پہلے آب اور بعد میں عشق تخلص اختیار کیا۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے مصطفیٰ علی تھے، یہ بھی شاعر تھے اور انہوں نے اپنا تخلص اثیر رکھا۔ موصوف بسلسلۂ ملازمت چونکہ وردھا (مہاراشٹر) میں قیام پذیر تھے، اس لیے وہاں کے علمی حلقے میں خاصے مقبول و معروف ہوئے، لیکن رٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنا مستقر دہلی کو بنایا۔ وہ سادہ مزاج اور شہرت سے دور بھاگنے والے انسان تھے، اس لیے یہاں ایک مخصوص حلقے میں مشہور ہوئے۔ زیر نظر مضمون انہیں سے متعلق ہے۔

اثیر کا دادھیال یعنی اصل وطن تو بندگی میاں والا قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ تھا، لیکن ان کی پیدائش ۱۹۰۶ء میں فتح پور ضلع بارہ بنکی یعنی ننیہال میں ہوئی۔ یہیں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ بزرگوں نے دنیا کی عظیم ترین ہستی رسول اکرم (ﷺ) کے متبرک نام نامی اور اسم گرامی کو تبرکاً و تیمناً ان کے لیے تجویز کیا۔ اس طرح ان کا نام مصطفیٰ علی رکھا گیا۔ رواج کے مطابق موصوف کی عمر جب چار سال کی ہوگئی تو حسب دستور خاندان ان کی بسم اللہ ہوئی۔

موصوف نے والدین کی زیر نگرانی اور نانا و نانی کی سرپرستی میں بہت جلد قرآن شریف مکمل کر لیا۔ بعدہ اردو فارسی نیز دینیات کی تعلیم کے لیے قصبے ہی کے ایک بزرگ عالم دین مولوی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اس کے بعد عصری تعلیم کے حصول کے لیے وہ اپنے والد شاہ ممتاز علی آہ کے پاس ڈونگر گڑھ ضلع چھتیس گڑھ چلے گیے جو ان دنوں وہاں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے وہیں کے ایک اسکول میں داخل ہوکر جونیر ہائی اسکول کا امتحان اچھے نمبرات سے پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے چونکہ وہاں بہتر مواقع نہیں تھے، اس لیے انہیں اپنے برادر اکبر شاہ عبدالعلی کے پاس فیض آباد جانا پڑا، اس لیے انہوں نے فیض آباد انٹر کالج سے ہائی اسکول پاس کیا جو اُس زمانے میں میٹرک کے نام سے معروف اور بڑی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میٹرک کی بنیاد پر سرکاری ملازمتیں بھی مل جایا کرتی تھیں، اور

یہی ہوا کہ بندوبست کے محکمے میں ان کا تقرر ہو گیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ مہاراشٹر کے مشہور علاقے وردھا میں (جو گاندھی جی کے وردھا آشرم کے نام سے مشہور ہے) ۱۹۳۶ء میں سیل ٹیکس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔

مصطفیٰ علی جس عہد سے تعلق رکھتے تھے، اس زمانے میں بڑائی اور بزرگی کی پہچان اعلیٰ خاندان اور اعلیٰ نسل کے علاوہ صاحب علم و فضل ہونا اور وہ بھی شاعری کرنے کی علامت تھی۔ بالفاظ دیگر شاعر بلند مرتبہ گردانا جاتا تھا اور صاحب دیوان شعراء اعلیٰ درجے کے نجیب و شریف تصور کیے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو ہر طرح سے نوازا تھا، دادیہال اور نانیہال دونوں ہی جگہ شاندار محلات بھی تھے اور مال و دولت بھی، جاہ و حشمت بھی اور عزت و ثروت بھی۔ مزید براں یہ خاندان علم و ادب کی دولت سے بھی مالا مال تھا، اور گھر میں شعر و شاعری کا چرچا (جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، ان کے والد ممتاز علی خود بھی شاعر تھے، اور آہ تخلص کرتے تھے۔ ریاض خیر آبادی اور جلیل مانکپوری ان کے ہم عصر تھے۔ یہ سبھی استاد الشعراء حضرت امیر مینائی کے شاگردوں میں صف اول میں گنے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں مصطفیٰ علی کے برادر اکبر شاہ عبدالباری بھی شاعری کرتے تھے، تو جس گھر میں یہ ماحول ہو اور جہاں صاحب خانہ اور اس کا بیٹا خود شاعر ہو، وہاں ایک باصلاحیت اور موزوں طبع، باذوق نوجوان کے لیے شاعری کرنا کتنا آسان ہوگا۔

یہ ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا مصطفیٰ علی کو بھی نصیب ہوئی، اس عہد کی فارغ البالی، عیش کوشی اور عیش سامانی اور موزونیٔ طبع نے ابتداء ہی سے شاعری کی طرف راغب کر دیا۔ اور انہوں نے غزلیں کہنا شروع کر دیں، اثیر تخلص اختیار کیا۔

لیکن بہت سی غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں اپنا نام مصطفیٰ بطور تخلص استعمال کیا ہے، ممکن ہے اثیر تخلص اختیار کرنے سے قبل تخلص کی جگہ پر اپنا نام مصطفیٰ ہی لکھتے رہے ہوں۔ بہر حال انہوں نے ابتداء اپنے برادر اکبر عبدالباری عشق کو اپنا کلام دکھایا اور ضرورت پڑی تو اپنے والد ممتاز علی آہ سے بھی اصلاح لی۔

اثیر نے غزل، قصیدہ، رباعی، مخمس، مسدس اور دیگر اصناف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ انہیں تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی بیاض اور متفرق ڈائریوں میں قطعات پیدائش و وفات، رخصتی و سہرے، سالگرہ، اور افسران کے تبادلوں نیز ان کی آمد پر الوداعیہ و استقبالیہ جیسے بہت سے تاریخی قطعات بھی موجود ہیں۔ شاعری سے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ مخصوص بحروں میں مخصوص انداز کی ہی شاعری کامیاب ہوتی ہے۔ نیز معقول ردیف و قافیے کا بھی التزام ضروری ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

اس کی تائید ان اشعار سے ہوتی ہے:

تم نے غزل لکھی اثیر یا ہزل سرائی کی
چیز الگ ہے شاعری، شعر کا فن کچھ اور ہے

شاخ کمزور شاعری کی اثیر
اس زمانے میں تو پھل نہیں سکتی

مصطفیٰ ہے شعر ناقص گر نہیں پختہ ردیف
قافیہ آسان ہے، لیکن ہے مشکل سے مجھے

استاد محترم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ ''امیر، داغ، جلال، بحر اور تسلیم وغیرہ کا اُس عہد میں طوطی بول رہا تھا''.... ان شاعروں نے جس چیز کو شاعری سمجھا تھا، اس کو

فروغ دینے کے لیے وہ بڑی محنتیں برداشت کرتے تھے۔ایک ایک قافیہ کو خوبصورتی کے ساتھ نظم کرنے میں اور ایک ایک مناسب لفظ کی تلاش میں بہت غور وخوض کرتے تھے۔ان کے نزدیک شاعری ایک مقدس فریضہ تھی جس کو انجام دینے میں وہ اپنی جان وروح تک لگادیتے تھے''۔

(امیر مینائی - مؤلفہ شاہ ممتاز علی آہ صفحہ۴)

اُن کی شاعری اُن کی اپنی نظر میں اس شعر کی مصداق ہے:

لفظ ہیں ترشے ہوئے، مضمون سب بکھرے ہوئے
چشمۂ کوثر کی ہے دھوئی ہوئی زباں میری

اثیر سادگی پسند، صوفی منش اور اللہ والے بزرگ تھے۔ لیکن ان کے کلام میں بلا کا تغزل ہے۔ان کی شاعری کلاسکی انداز کی تھی۔ وہ زبان بھی سادہ استعمال کرتے تھے اور عام فہم سیدھے سادے انداز میں غزلیں کہتے تھے۔ان کے اشعار سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے محبوب پر نچھاور ہوئے جارہے ہیں۔اس کی بھرپور تعریف کرتے ہیں لیکن کیا مجال کہ کہیں بھی تہذیب کے دائرے سے باہر قدم رکھا ہو۔طرز بیان میں دور دور رکاکت اور ابتذال کا شائبہ بھی نہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے رنگ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

میگوں، رسیلی، بانکی، شرمیلی، موہنی سی
دنیائے حسن دیکھی، اس چشم فتنہ گر میں

دہن غنچہ ہے قد شمشاد، سنبل زلف پیچاں ہے
نظارہ اس گل خوبی کا اک سیر گلستاں ہے

وہ پیاری پیاری شکل وہ انداز دلفریب
رہتا نہیں ہے دیکھ کے دل اختیار میں

کیا مضطرب تھی پہلے پہل کی نگاہِ یار
اٹھی، ملی، جھکی، اِدھر آئی اُدھر گئی

گیسو کا ذکر ان سے کہاں کرنے پائے ہم
کچھ الجھی الجھی باتیں ہوئیں انتشار میں

ترا بھولے پن سے کہنا کہ ''یہ حالِ زار کیوں ہے؟''
ہے اِسی ادا میں مضمر مری جان کی تباہی

اثیر کی ذاتی زندگی جس طرح کے تلخ وشیریں تجربات سے گذری تھی اور انہوں نے زندگی کے اتار چڑھاؤ کا جس طرح مشاہدہ کیا تھا، ان کو اشارات وکنایات میں (جو غزل کا خاص انداز ہے) انہوں نے اپنی غزلوں میں اس طرح پیش کیا کہ ان میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کی جھلک نظر آنے لگی۔ملاحظہ ہوں چند اشعار:

دل شکن صدمے، شکستہ خاطری، افتادِ غم
اور کیا ہوگا بھلا پھوٹی ہوئی تقدیر میں

زباں بند، لب خشک سوزِ دروں سے
کہانی محبت کی کیسے سنائیں؟

خیال نوک مژگاں کی نہیں گلکاریاں تن میں
کھِلا ہے لالۂ احمر کا تختہ صحنِ گلشن میں

ہے کون غم جو ہم کو خدا کی قسم نہیں
اب کی ہماری عید محرم سے کم نہیں

کیا تجھ کو بتائیں اے ہمدم کس طرح بسر ہوجاتی ہے
روتے کہیے، ہنستے کہیے، مرکٹ کے گذر ہوجاتی ہے

جب تک نہ آئے ہم ہوئی تقسیمِ غم نہیں
بٹنے لگا سرور تو موجود ہم نہیں

یہ سچ ہے عیش کے ساتھی تھے ہمنوا اپنے
کوئی نہیں مرے حالِ تباہ میں شامل

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ان تلخ تجربات نے ان کی غزلوں کو اصلیت پسندی اور تابناکی بخشی، چونکہ وہ ایک خوددار اور صاف گو انسان تھے، اس لیے ان کی شاعری میں اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

اثیر کے والد ممتاز علی آہ امیر مینائی کے براہ راست شاگرد تھے، کچھ اس تعلق سے اور کچھ خود ان کے کلام سے متاثر تھے، اس لیے امیر مینائی سے عقیدت تھی، بلکہ ان کی تقلید کو اپنے لیے فخر سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں امیر کی صاحبزادی نزہت عاصم نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "ابا حضور امیر مینائی کے عاشق تھے۔ وہ اکثر و بیشتر رات کو سونے سے قبل امیر مینائی کا نعتیہ کلام بڑی خوش الحانی اور دلسوزی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے"۔

اثیر اس تعلق کا اظہار ایک شعر میں یوں کرتے ہیں:

یہ فیض ہے امیر سخنور کا اے اثیر
غزلیں مشاعروں میں سنانے لگا ہوں میں

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ "وردھا" (مہاراشٹر) کے زمانۂ قیام میں ممکن ہے انہوں نے مشاعرے پڑھے ہوں، لیکن ۱۹۶۵ء تا ۱۹۸۷ء یعنی قیام دہلی میں جہاں تک میری معلومات ہیں، انہوں نے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔

اثیر کے یہاں سادہ زبان کے بھی خاصے اشعار موجود ہیں، بلکہ بعض غزلیں تو پوری کی پوری سادگی اور سہل ممتنع کی زندہ مثال ہیں۔ ایک مختصر غزل اور چند شعر ملاحظہ ہوں:

آئیں نہ آئیں آنے والے
جائیں گے لیکن جانے والے
اٹھ گئی محفل بجھ گئیں شمعیں
آتے ہی رہے آنے والے
آئے نہ اب تک جانے والے
پھر بھی جاتے ہیں آنے والے
جان پہ بھی اب کھیل رہے ہیں
بازی دل کی لگانے والے
صبر ذرا سا صبر اثیر اب
غم کے دن ہیں جانے والے

دلِ حسرت زدہ کی خیر ہو یارب
مرا جی آج کچھ گھبرا رہا ہے
سینے سے لگائے ہوں ترا غم
برسوں مرا ہم سفر رہا ہے
بیمار کو اپنے دیکھ لو اب
بے چارہ غریب مر رہا ہے

محاورات اور منظر کشی میں بھی اثیر کو بڑی مہارت تھی، دونوں کا لطف اٹھایئے:

کچھ قول کا تم کو پاس نہیں، کیا عہد کیا تھا یاد نہیں
طوطے کی طرح آنکھیں پھیریں، نظروں کا ملانا بھول گئے

مہک بھینی بھینی چلی آ رہی ہے
ہوئے جاتے ہیں کوچے کوچے معطر

نوا سنجیاں بلبلوں کی غضب ہیں
اٹھائے ہوئے ہیں چمن اپنے سر پر

ہر اک گا رہا ہے خوشی کا ترانہ
ہوئے جاتے ہیں پھول جامے سے باہر

ذرا اشعار کا زیر و بم اور موسم بہار کی منظر کشی ملاحظہ کیجئے:

اُگا ہے سبزہ اس قدر کہ ہے زمردیں زمیں
جدھر نظر اٹھائیے بچھا ہے فرش مخملیں

جو شاخِ گل لچک گئی، ہر اک کلی چٹک گئی
اِدھر صبا مہک گئی، اُدھر فضا مہک گئی

وہ قمریوں کے ہمہمے، وہ بلبلوں کے چہچہے
وہ طائروں کے زمزمے، وہ مہوشوں کے قہقہے

جدت وندرت کے چند اشعار سے لطف اندوز ہوتے چلئے:

پروانوں نے پر مار کے شمعوں کو بجھایا
چہرے سے جو محفل میں نقاب اس نے اٹھادی

تیرا تصور جمال اور میری آہِ نیم شب
حسن سے وہ بلند تر، عشق سے یہ لطیف تر

کسی پردہ نشیں کا پاسِ رسوائی سے اشکوں کو
کہ آنکھوں سے نکل کر منہ چھپالیتے ہیں دامن میں

ریاض خیر آبادی نے کبھی شراب چکھی نہیں، تاہم ان کی شاعری شراب کے اردگرد گھومتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ''شاعرِ خمریات'' مشہور ہوگیے۔ اثیر نے بھی شراب کی بو تک نہیں سونگھی ہے، لیکن اس کا تذکرہ بہت سی جگہوں پر کیا ہے، اور اس طرح جیسے وہ ایک قدیم بادہ خوار ہوں۔ ملاحظہ ہو:

مرتے مرتے بھی نہ چھوٹا ساغرِ مئے ہاتھ سے
کیا خط پیمانہ لکھا تھا مری تقدیر میں

ساقی پلا شراب بس اب تاب غم نہیں
جامِ سفال تو ہے، اگر جامِ جم نہیں

اٹھو رندو! جنابِ شیخ میخانے میں آئے ہیں
پلاؤ ان کو لاکر صاف ستھرے پاک برتن میں

ساقی یہ تری مست نگاہوں کا اثر ہے
جو جام ہے میخانہ ہے، میکش کی نظر میں

ہوا عرصہ کہ میں نے بادہ خواری چھوڑ دی واعظ!
کبھی دو چار ساغر بھر کے پی لیتا ہوں ساون میں

اثیر کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی بہت سی غزلیں اور نعتیں بغیر مطلع یا بغیر مقطع کے ہیں۔ اس کے برعکس بعض غزلوں اور نعتوں میں کئی کئی مطلعے اور دو دو مقطعے بھی ہیں۔ سر دست راقم سطور کا یہ ایک تعارفی مضمون ہے، لیکن یہ بھی صرف غزلیات سے متعلق ہے، دوسری اصنافِ سخن پر کچھ لکھنا یا ان پر رائے زنی کرنا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ تفصیلی مطالعہ کے بعد ہی تبصرہ کیا جائے۔

اثیر عمر کے آخری ایام میں ضعیفی کے علاوہ مختلف امراض میں گرفتار ہوگیے تھے، بہتر سے بہتر علاج ہوا، لیکن وقتِ موعود آپہونچا، اور وہ ۱۷/جنوری ۱۹۸۷ء کو اپنی قیام گاہ جامعہ نگر نئی دہلی میں اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔ إنا لله و إنا إليه راجعون۔ جامعہ ملیہ کے قبرستان ان کی آخری آرام گاہ بنی۔

دعائے شام وسحر

مصطفیٰ علی اثیر

دعائے شام وسحر لا إلـــه إلا الله
نہ کوئی خوف نہ ڈر لا إلـــه إلا الله

متاعِ فکرونظر لا إلـــه إلا الله
دوائے دردِ جگر لا إلـــه إلا الله

نہ رہنما کی ضرورت نہ نقشِ پا کی تلاش
مرا چراغ سفر لا إلـــه إلا الله

ملے جو دولت کونین بھی تو ٹھکرادوں
مرے ہے مدنظر لا إلـــه إلا الله

یہ ایک ضرب لگاتے ہی ٹوٹ جائیں گے
ان آئینوں سے نہ ڈر لا إلـــه إلا الله

خدا کرے کہ زمانے پہ ہو اثر انداز
مری دعائے سحر لا إلـــه إلا الله

ہزار مجھ سے زمانہ خلاف ہو لیکن
مرا شریکِ سفر لا إلـــه إلا الله

بہ فیضِ عشق مجھے معرفت ہوئی حاصل
مرے جنوں کا ثمر لا إلـــه إلا الله

اثیر دوڑ کے منزل مرے قدم لے گی
مرا ہے زادِ سفر لا إلـــه إلا الله

غزل

مصطفیٰ علی اثیر

نہ آہ نکلی تھی دل سے پہلے، نہ درد اٹھا تھا جگر سے پہلے
دل و جگر کی خبر کسے تھی، تمہاری پہلی نظر سے پہلے

چمن چمن تھا وہی بیاباں نکل گیا میں جدھر سے پہلے
جنوں مرا اور ہی جنوں تھا، قیودِ دیوار و در سے پہلے

یہ طاقتِ بال و پر مبارک تجھے مگر اے چمن کے ساتھی
فضا چمن کی بھی دیکھ لینا نمائشِ بال و پر سے پہلے

امید کی روشنی بھی پیہم، خوشی کا پہلو کوئی نہ کچھ غم
وہ میرا عالم کہ جیسے عالم نمود شام و سحر سے پہلے

کہاں کی راہیں کہاں کی منزل، کوئی یہ رہبر سے جا کے کہہ دے
ابھی وہی طے نہیں ہوئی ہیں جو منزلیں ہیں سفر سے پہلے

ہزار ہمت ہزار کوشش مگر یہاں زندگی بھر اپنی
کوئی بھی مشکل جو حل ہوئی ہو سفارشِ چشمِ تر سے پہلے

یہ غم یہ بیماریٔ محبت نہیں قیامت تو اور کیا ہے
کہ اب نہیں کاٹے کٹ رہے ہیں جو لمحے تھے مختصر سے پہلے

یہ میں نے مانا قضائے مبرم مقررہ وقت ہو چکا ہے
گلے تو مل لوں ارے ستمگر میں اپنے دیوار و در سے پہلے

اثیر ہے معصیت کا پیکر الٰہی مہلت اسے عطا کر
غریب زادِ سفر تو لے لے عدم کو اپنے سفر سے پہلے

خطبۂ صدارت

برائے علاقائی سیمینار

''اردو میں قصہ نگاری''

منعقدہ امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)

بتاریخ ٢٣/ دسمبر ٢٠١٠ء بروز جمعرات

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر رابطہ ادب اسلامی برصغیر

حضرات! رابطہ ادب اسلامی عالمی برصغیر ہند و پاک کے تحت سال میں ایک سیمینار ایسا منعقد کیا جاتا ہے جس میں کوشش ہوتی ہے کہ بیرون ہند کے نمائندے بھی شریک ہوں، اور ادب اسلامی کے اُس عنوان پر جو سیمینار کے لئے طے کیا جاتا ہے، ان کے تحقیقی مقالے بھی پیش ہوں۔ ایسے سیمینار الحمدللہ تقریباً گذشتہ ٢۵ سال سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوتے رہے ہیں، جن مقامات پر یہ سیمینار منعقد ہوئے ان میں دہلی، ممبئی، پونہ، بھوپال، حیدر آباد، بنگلور، اورنگ آباد، جمبوسر، بنارس، کلکتہ، رانچی، میرٹھ، لکھنؤ، رائے بریلی، الہ آباد، اعظم گڑھ، غازیپور، پٹنہ اور اسی طرح کے دیگر مختلف مقامات پر اور کامیاب طریقے سے منعقد ہوئے۔ پٹنہ میں یہ سیمینار رابطہ ادب اسلامی کا دوسرا سیمینار ہے۔ ١٩٩٩ سے قبل ہر سیمینار کی سرپرستی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جو رابطہ ادب اسلامی کے عالمی صدر تھے، تاحیات پابندی کے ساتھ، فرماتے رہے، اور ہر سیمینار کے لئے ایسے موضوع کو طے کیا جاتا رہا جو اپنی نوعیت کا نیا موضوع ہو، اور اس کا تعین ادب اور اسلامی نقطۂ نظر کے لحاظ سے کیا جاتا رہا ہے، مثلاً حمد و مناجات و دعاء، حدیث شریف کی ادبی و فنی خصوصیات، نعتیہ شاعری: تاریخی و علمی جائزہ و خصوصیات، دعوتی و اصلاحی ادب، سوانحی ادب و تذکرہ نویسی، ملفوظات و مواعظ ادب کے آئینہ میں، اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ، انسانی کردار سازی میں اخلاقی و اسلامی ادب کی خدمات، اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں علماء کی خدمات، قرآن کریم کا اعجاز بیانی، مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ اور علامہ محمد طاہر پٹنی و دیگر علماء گجرات اور ان کی ادبی و علمی خدمات وغیرہ۔

زیر انعقاد سیمینار کے لئے ''اردو میں قصہ نگاری کا جائزہ'' کا عنوان طے ہوا ہے، اور اس موضوع پر قصہ نگاری کا جو تعلق اسلامی نقطۂ نظر سے ہے، اس کو پیش نظر رکھا جائیگا، امید ہے کہ مفید اور تحقیقی مقالے سامنے آئیں گے۔ ہمارے پٹنہ میں مقامی طور پر متعدد موقر شخصیتیں ہیں جن کو اردو ادب میں خصوصیت حاصل ہے، ان کے علاوہ پٹنہ سے باہر بلکہ صوبہ سے باہر کی متعدد شخصیتوں کی بھی شرکت ہو رہی ہے، اس طرح انشاء اللہ یہ ایک اچھا اجتماع ثابت ہوگا، اور اس سے اردو ادب کے اس خاص سمت کے سلسلہ میں مفید اور معلوماتی و تحقیقی باتیں سامنے آئیں گی۔

حضرات! اردو زبان ایک بڑی جامع اور متنوع خوبیوں کی زبان کی حیثیت سے برصغیر ہند و پاک کو حاصل ہوئی، اس زبان کی تشکیل میں ملک کے سربرآوردہ طبقے، علماء و حکام پھر عوام اور کم علم طبقات سب کی مستعملہ زبانوں کے اثرات شامل ہیں۔ علماء کے لحاظ سے عربی کا اثر ہے، اور عربی زبان وہ زبان

ہے جو اسلامی اور دینی موضوعات کی حامل ہے۔ سربرآوردہ طبقے اور حکام اور دفاتر کی زبان فارسی رہی ہے، اس کی شرکت سے اس کی اصطلاحات اور تعبیرات اردو کو حاصل ہوئیں۔ فارسی کا ادب تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج رہا ہے، اس کے اثر سے اس کی ادبی خصوصیات بھی اردو کو حاصل ہوئی ہیں۔ اور عوام کی رعایت اور ان سے مخاطبت کی ضرورت نے ہندی زبان کی بھی اس میں واضح شرکت پیدا کی ہے۔ پھر انگریزوں کے عمل دخل کی وجہ سے انگریزی اصطلاحات کا بھی ایک حصہ اردو میں شامل ہوا ہے۔ اس طرح اردو اس ملک کی ایک متنوع خصوصیات کی جامع زبان بن گئی، اور اس زبان کی تشکیل کے بعد اس کی تکمیل تک پہونچنے پر اس میں زندگی سے تعلق رکھنے والے عمومی و خصوصی دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے حسن وافادیت پیدا ہوگئی ہے، اور فارسی وعربی کی شمولیت کی وجہ سے اسلام کا دینی وثقافتی سرمایہ بھی اس میں اچھا خاصہ آگیا ہے۔

اب اس وقت جبکہ موجودہ عہد میں ہمارے اس وسیع و عریض اور بڑے ملک میں اردو جیسی عوام وخواص کی مشترک اور مقبول عام وخاص زبان کو اصحاب اقتدار طبقے کی طرف سے وہ ہمت افزائی نہیں مل رہی ہے جس کی وہ مستحق ہے، خود ہم اردو دانوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ایسی گل وگلزار زبان کے بقاء اور اس کے تحفظ وترقی کے تعلق سے جو مفید کوششیں ہوں وہ اختیار کریں، اور ایسے پروگرام منعقد کیا کریں جن سے اس زبان کے بقاء اور کارگذاری کو تقویت حاصل ہوتی رہے۔ ہمارا یہ سیمینار بھی اس کی ایک کڑی قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرات! اردو میں قصہ نگاری ناول نگاری سے شروع ہوئی، اور بعد میں افسانوی ادب کا اضافہ ہوا، افسانہ ناول کے مقابلہ میں بہت مختصر ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اس کے پڑھنے کا موقع بھی ناول کے مقابلہ میں زیادہ حاصل ہوتا ہے، اور ناول ہو یا افسانہ، یہ ایسی صنف ہے جو پڑھنے کا ذوق رکھنے والوں کے ذہن اور جذبات کو غذا پہونچاتی ہے، یہ غذا ذہنی تسکین کا باعث بھی ہوتی ہے اور طبیعت انسانی کے کسی خاص پہلو کو طبیعتوں میں اجاگر کرتی ہے، اور وہ کسی ضروری نفسیاتی مقصد کے حصول کا ذریعہ بھی بنتی ہے، اس بات کو ناولوں کی صورت میں مثلاً عبد الحلیم شرر، ڈپٹی نذیر احمد جو اس صنف ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، ان کے ناولوں میں صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ نگاری کے رواج پانے پر ہم جب جائزہ لیتے ہیں تو اس کے کئی دور نظر آتے ہیں، جن میں حالات کے تغیر کے ساتھ تغیرات پیدا ہوئے، ان میں عام طور پر اہل اردو کے معاشرتی حالات اور نفسیاتی کیفیات میں مختلف طریقوں اور مقاصد کے لحاظ سے فرق ملتا ہے، اور اس طریقے سے اردو میں افسانہ اور ناول کے ادوار کی تاریخ جو ڈیڑھ صدی یا اس سے کم و بیش پر پھیلی ہوئی ہے، اور اس میں اس ملک کی معاشرت، حساس معاملات کے اجتماعی اور انفرادی حالات اور کیفیات کا جائزہ سامنے آتا ہے، انسانی زندگی معاشرتی اور نفسیاتی لحاظ سے خیر وشر دونوں کی حامل ہوتی ہے، ان سے واقفیت انسان کو آگے قدم بڑھانے میں اور اپنی ضرورت کی تکمیل کے ذرائع جاننے میں مدد ومعاون ہوتی ہے، ان کا احساس دلانے میں معاشرتی زندگی جس میں سیاسی اور معاشرتی اور اخلاقی سب پہلو پائے جاتے ہیں، ان سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے لئے قصہ نگاری کے مؤثر ذرائع بڑے سودمند ہوتے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو دیکھ کر سیکھنے اور دوسروں کے حالات کا اپنے حالات سے موازنہ کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے، اس سے اپنی اصلاح و ترقی میں جو مدد ملتی ہے، وہ اس کا اچھا ذریعہ بنتے ہیں، اس سلسلہ میں با مقصد ناول اور افسانے بڑی حد تک اچھا کردار انجام دیتے ہیں۔

بیرونی اقتدار کے آغاز میں اور اس کے بعد ہندوستان کا معاشرہ جس طرح بڑی ابتری کا شکار رہا ہے، اور غریب و امیر کے درمیان گہرا فرق اور رسم و رواج کے دباؤ میں رہنے والے اور انسانی اقدار اور اخلاق سے بے بہرہ خود غرضی کا شیوہ رکھنے والے اور اختلاف و پراگندگی کا شکار طبقات کی زندگی کا طرز عام ہو گیا تھا، اس پر تعمیری اور صالح ذہن رکھنے والے لوگوں کا احساس بیدار ہوا، اور ان میں صاحب قلم حضرات نے جن میں ادبی صلاحیت تھی، ان میں سے حساس لوگوں نے اپنی ادبی صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے ناول نگاری اختیار کی، اس نے قوم کو ایک اچھا پیغام دیا، اور پھر یہ سلسلہ حالات کے فرق کے ساتھ چلتا رہا، اور انگریزوں کے اقتدار نے تعلیمی ذریعہ سے اور ادبی طریقۂ مخاطبت سے جو اثر ڈالا، اس نے اس ادبی صنف کو بھی نیا رنگ دیا۔ پھر اگلے دور میں امیری اور غریبی کی کشمکش کو اہمیت دیکر جو رجحانات کمیونسٹ بلاک سے آئے، اس نے بھی ادب کی اس صنف کو اپنا مخصوص رنگ دیا، لیکن یہ رنگ خالص مادیت اور دنیاوی مصلحت اور مذہب مخالف رخ تک چلا گیا، اس کا مقابلہ دینی احساس رکھنے والوں نے کرنے کی کوشش کی، اور انہوں نے بھی قصہ نگاری کے ذریعہ کو اپنایا، اور وہ سلسلہ الحمد للہ قائم ہے، یہ جو تبدیلیاں اور تدریجی فرق قصہ نگاری کے میدان میں سامنے آیا، انشاء اللہ آپ اس سیمینار میں پیش ہونے والے مقالات میں دیکھ سکیں گے۔

حضرات! ادب کو اگر محض لذت اور لطف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو وقتی طور پر لطف لینے یا کوئی لذیذ یا پسندیدہ پھل کھا لینے کی حد تک اپنا کام انجام دیتا ہے، لیکن ادب کو انسانی ضرورت کا ایک ذریعہ ہونے کی بناء پر با مقصد بنانا ایک بڑی خدمت ہے، البتہ اس میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ مقصد کی نوعیت کیا ہے، محض دنیاوی منفعت جو خود غرضی اور نفس پرستی تک محدود رہے، یا وہ مقصد جس میں انسانیت کے لحاظ سے خیر خواہی اور خیر طلبی ہو، اور مقصد کبھی سازشی بھی ہو سکتا ہے کہ کسی خود غرضانہ مفاد کے لئے لوگوں کو ان کی صحیح راہ سے ہٹا کر غلط راہ پر ڈال دیا جاتا ہے، اور اس کی ایک مثال میڈیا کے موجودہ رجحان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بہر حال انسانی خیر طلبی کا مقصد افسانہ نگاری سے بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے انسانیت نواز مقصد کو جس کی رہنمائی خاص طور پر ہم کو قرآن و حدیث سے ملتی ہے، اختیار کرنے اور بڑھانے کو اپنایا ہے، اور اسی کے تحت ہمارے یہ سیمینار منعقد ہوتے ہیں، اور یہ ہم بڑی خدمت سمجھتے ہیں کہ ادب جیسے مؤثر ذریعے سے ہم انسانوں کو انسان بنانے کی جو خدمت انجام دے سکتے ہیں، انجام دیں، اور اس سلسلہ میں ہم اپنے مالک و خالق رب العالمین سے توفیق و قبولیت کی دعاء کرتے ہیں۔

اخیر میں ہم محترمی جناب حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب امیر شریعت بہار و اڑیسہ و جھارکھنڈ کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے امارت شرعیہ پھلواری شریف میں سیمینار کے انعقاد کا موقع دیا، اور ڈاکٹر عتیق الرحمٰن صاحب جو کہ ہمارے رابطہ ادب اسلامی کے پٹنہ حلقہ کے ذمہ دار ہیں، کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کو کامیاب بنانے میں دلچسپی سے کام لیا۔

سکریٹری رپورٹ برائے سیمینار

''اردو ادب میں قصہ نگاری''

منعقدہ ۱۶/محرم ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۳/دسمبر ۲۰۱۰ء بروز جمعرات بمقام پٹنہ

مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی
سکریٹری رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

حضرات! ہم سب سے پہلے آپ کا استقبال کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت قبول فرمائی اور زحمت سفر برداشت کر کے اس مذاکرۂ علمی میں تشریف لائے جو عالمی رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر کی پٹنہ شاخ کی طرف سے اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے تعاون سے ''پھلواری شریف'' میں منعقد ہو رہا ہے، جس کا موضوع ''اردو ادب میں قصہ نگاری'' ہے۔ اس سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں ان کا جائزہ بھی لینا ہے۔

حضرات! عالمی رابطہ ادب اسلامی کی خشت اول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، اور وہی اس کے اولین صدر تھے، بلکہ درحقیقت وہ اسلامی ادب کی فکر کے مؤسس تھے۔ چنانچہ انہی کی دعوت پر ۱۴۰۱ھ (۱۹۸۱ء) میں ندوۃ العلماء میں ادب کا پہلا سیمینار منعقد ہوا، جس میں عالم عربی کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے چیدہ ادباء وشعراء شریک ہوئے، اور اس کے نتیجے میں ادب اسلامی کی عالمی انجمن کی تشکیل ہوئی، پھر اس فکر نے ترقی کی اور عرب ادباء نے بھی اس کا استقبال کیا، ان سب کا تذکرہ حضرت مولاناؒ نے اپنی خود نوشت سوانح '' کاروان زندگی'' میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

'' مجھے اپنی تدریسی وتعلیمی مشغولیت کے زمانہ میں بھی اور اپنے تحریری وتصنیفی دائرہ کے اندر بھی، ہمیشہ اس حقیقت کا ادراک رہا کہ ادب اپنے اندر عظیم تعمیری وتخریبی طاقت رکھتا ہے۔ اس سے ایک طرف عقائد صحیحہ کی استواری، اور صحت مند اور صالح رجحانات کی آبیاری کا کام لیا جاسکتا ہے، تو دوسری طرف اخلاقی انسانی قدروں پر تیشہ زنی اور ذہنی و معاشرتی انتشار کا بھی، اور ہر دور میں اس کی روشن اور ناقابل انکار شہادتیں ملتی ہیں، لیکن اس دور میں ادب کی (اپنے وسیع معنی میں) جدید طاقتور وسائل کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے جہانگیری اور فرمانروائی بہت بڑھ گئی ہے، عرصہ سے یہ دیکھا جارہا ہے کہ جس طرح کبھی فلسفہ کے راستہ سے الحاد اور تشکیک کا سیلاب مسلمانوں کے علمی وفکری طبقہ میں آتا تھا، اس کے بعد سائنس (خاص طور پر علوم طبیعیہ) کے راستہ سے تعلیم یافتہ طبقہ میں آنے لگا، اور کہیں کہیں نفسیات (سائکالوجی) اجتماعیات (سوشیالوجی) اور اقتصادیات وسیاسیات کے راستہ سے آتا تھا، اب بہت سی جامعات اور دانشگاہوں میں ادب کے

ذریعہ سے آرہا ہے۔

خاص طور پر یہ بات فکر و دعوت اسلامی کے حاملین کے لیے تشویش کا باعث تھی کہ بلادِ عربیہ بالخصوص مصر میں تقریباً نصف صدی سے ادب و تنقید اور نوجوانوں کو ذہنی و ادبی غذا پہونچانے کے میدان پر اُن ادباء اور اہل قلم کی اجارہ داری قائم ہوگئی تھی، جن کے عقائد میں خود تزلزل، ذہن میں انتشار، اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا جاتا تھا، اس لیے ایک طرف اس کی ضرورت تھی کہ عربی ادب کے خزانۂ عامرہ سے وہ طاقتور اور دل آویز ادبی و تحریری نمونے نکالے جائیں اور ان کو نمایاں کیا جائے، جن کو سہولت پسندی اور قدیم مؤرخین ادب کی پیروی میں نظر انداز کردیا گیا، یا اس قصور میں کہ وہ کسی عالم و داعی اور دینی شخصیت کے قلم سے نکلے ہیں، ان کو ''ایوان ادب'' سے دور کردینے یا الگ رکھنے کی سزا دی گئی، اور صدیوں ان پر پردہ پڑا رہا۔ دوسری ضرورت اس کی تھی کہ ادب عربی کے ایسے اساتذہ، اہل قلم اور دانشوروں کو جمع کیا جائے جو عربی ادب و انشاء اور تنقید و تاریخ ادب کو صحیح رخ پر لگانے کی کوشش کریں، اور جدید نسل کو صالح غذا پہونچانے کے لیے ایک نیا ذخیرۂ کتب (مکتبہ) اور ایک نیا مدرسۂ فکر (مکتب خیال) پیدا کرسکیں۔

اس مقصد سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ۱۷-۱۹ر اپریل ۱۹۸۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار کیا گیا جس کا موضوع ''عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کی ادبیات میں عموماً اسلامی عناصر کی تلاش'' تھا، توقع اور قیاس سے بڑھ کر ممالک عربیہ میں اس دعوت و تحریک کا استقبال ہوا اور اس کو Response ملا، اس میں حصہ لینے کے لیے متعدد عرب ممالک کے ممتاز فضلاء و ادباء لکھنؤ آئے، جن میں دورِ حاضر کے متعدد بلند پایہ مصنفین، فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور شعراء و ادباء شامل تھے۔''

اس سیمینار میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جو اختتامی تقریر کی، اس میں اس سیمینار کے بنیادی مقصد اور ضرورت پر روشنی ڈالی، اور اس سلسلے میں ہندوستان میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ پیش کیا۔ یہاں اس کا صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ادب کا بھرپور انداز میں تعارف کرایا ہے:

> ''ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے، اور اس کو قبول کرے۔ میں نے کل عربی سیمینار میں کہا تھا کہ حسن پسندی تو یہ ہے کہ حسن جس شکل میں ہو اسے پسند کیا جائے۔ بلبل کو آپ پابند نہیں کرسکتے کہ اس پھول پر بیٹھے، اُس پھول پر نہ بیٹھے، لیکن یہ کہاں کا حسن مذاق ہے، اور یہ کہاں کی حق پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی میخانے

کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اوراس سے لطف اٹھایا جائے، اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمو اور اپنی جلوہ نمائی کے لیے مسجد کا سہارا لیا؟۔ اقبال کا شعر تو ان کے سامنے نہیں پڑھ سکا تھا، مگر آپ کے سامنے پڑھ سکتا ہوں۔

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

ہمیں حسن بے پروا سے مطلب ہے کہ شہر و صحرا سے؟ تو ادب کے ساتھ معاملہ یہی کیا گیا۔"

اسی مجلس مذاکرہ کا اثر تھا کہ اس کے بعض اہم ارکان و شعراء نے (جن میں اکثر جامعة الإمام محمد بن سعود، ریاض، سعودی عرب کے موقر اساتذہ تھے) رابطة الأدب الإسلامي کے نام سے ریاض میں ایک عالمی تنظیم قائم کی، اور مئی ۱۹۸۴ء کی کسی تاریخ کو ان کا ایک وفد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے مکہ معظمہ میں ملا، اور ان سے اس کی صدارت قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مدینہ طیبہ سے ۷/مئی ۱۹۸۴ء کو جدہ واپسی ہوئی، مکہ مکرمہ جا کر عمرہ کیا۔ وہاں عربی ادب کے ممتاز علماء کا ایک وفد آکر ملا، یہ وفد ریاض کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی اور مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر عبدالباسط بدر، استاد حیدر غدیر اور ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح پر مشتمل تھا۔ یہ حضرات ریاض اور مدینہ منورہ سے خاص غرض سے مکہ مکرمہ آئے تھے۔ انہوں نے رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد بیان کیے، اور اس کے آئین کا مسودہ پیش کیا اور مجھ سے اس کی سربراہی قبول کرنے اور اس رابطہ کو ایک بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کرنے کی اجازت دینے کی خواہش کی۔"

غرض مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے جنوری ۱۹۸۶ء میں رابطہ ادب اسلامی کا عام جلسہ ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، جس میں رابطہ کے دستور کو منظوری دی گئی، اور اس طرح رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی مجلس امناء کا پہلا جلسہ استنبول ترکی میں جون ۱۹۸۶ء میں منعقد ہوا، پھر مجلس امناء کے جلسے مدینہ منورہ، قاہرہ، عمان، اردن، فاس مراکش اور استنبول وغیرہ میں منعقد ہوتے رہے۔

رابطہ ادب اسلامی کی باقاعدہ تشکیل کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ رابطہ کے تاحیات صدر منتخب کیے گئے، اور اس کے دو دفتر قرار پائے، ایک ہندوستان اور شعبہ برصغیر و ممالک مشرقیہ کے لیے اور دوسرا عالم عربی کے لیے۔ اور جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (اس وقت کے صدر شعبۂ عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء اور موجودہ ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) ہندوستانی شعبہ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے، اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن رافت الباشا مکتب عربی کے سکریٹری جنرل ہوئے۔ اور رابطہ کا صدر دفتر ندوۃ العلماء میں قرار پایا۔ اور حضرت مولانا کی زندگی بھر یہ مرکزی دفتر اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔ پھر حضرت مولانا کے انتقال کے بعد

جب ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح صدر ہوئے تو مرکزی دفتر ریاض منتقل ہوگیا۔اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر اور شعبۂ برصغیر کے صدر منتخب ہوئے۔

ادب اسلامی کے اس خیال اور تحریک کو عمومی مقبولیت حاصل ہوئی، چنانچہ دونوں دفاتر کے ان کے تابع ملکوں میں بہت سی فروع قائم ہوئیں جیسے ہندوستان، بنگلہ دیش، پاکستان، سعودی عرب، مصر، اردن، ترکی، مراکش اور الجزائر وغیرہ۔

ان تمام ملکوں کے مختلف شہروں میں کئی سیمینار منعقد ہوئے، جن کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ نیز رابطہ ادب اسلامی کے مسائل پر غور وفکر کے لیے ہر سال مجلس امناء کا جلسہ ہوتا ہے، اور ہر تین سال پر سارے اراکین کا ایک عمومی اجلاس ہوتا ہے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی نے ادب کے مختلف موضوعات واصناف خصوصاً نقد ادب، تاریخ ادب، قصہ، ڈراما اور ادب اطفال پر عظیم اور بیش قیمت لٹریچر تیار کر دیا ہے، اور مصر، ترکی، پاکستان، سعودی عرب اور ہندوستان سے اس کے ترجمان کے طور پر ادب اسلامی کے مجلات نکلتے ہیں۔

ہندوستان میں رابطہ ادب اسلامی کی شاخیں اور فروع دہلی، حیدرآباد، بھوپال، اورنگ آباد، ممبئی، پونہ، بھٹکل، بنگلور، کلکتہ، پٹنہ اور رانچی وغیرہ میں ہیں اور صدر دفتر لکھنؤ میں ہے، اور ادب اسلامی کے تعلق سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی دفتر کے تحت اب تک مختلف موضوعات پر ۲۸/سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ ہندوستان کی مختلف شاخوں کے تحت بھی متعدد علاقائی سیمینار اور ماہانہ نشستیں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ صحافت کے موضوع پر متعدد سیمینار دہلی، بھوپال، بھٹکل اور رائے بریلی میں منعقد ہوئے۔ گذشتہ سال قصے کی ادبی حیثیت پر پٹنہ اور رائے بریلی میں سیمینار منعقد ہوئے۔

حضرات! اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قصہ ادب میں اہم صنف ہے، اور وہ بعض وقت شعر سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے، شعر کا اثر وقتی ہوتا ہے، لیکن قصہ پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ قصے کا دور اور اس کا عمل شعر کے دور اور اس کے عمل سے پہلے شروع ہوجاتا ہے۔ اس کی ابتداء ماں کی گود سے ہوتی ہے۔ مائیں اپنے ذوق اور مزاج کے اعتبار سے قصوں کے ذریعہ بچے کا دل بہلاتی ہیں۔ اور بعض وقت بعض قصے بچے کے ذہن کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بعض بڑی شخصیتوں کے تذکرے میں ایسے قصوں کا تذکرہ ملتا ہے جو انہوں نے بچپن میں سنے یا پڑھے۔ بعض قصے نفسیات اور فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

قصے کی اہمیت اور تاثیر کے پیش نظر مصلحین اور معلمین ذہن سازی کے لیے اور تاثیر قلبی کے لیے قصوں کا سہارا لیتے ہیں۔ قرآن کریم میں اور حدیث شریف میں بھی قصوں کا عظیم سرمایہ ہے۔ قرآن کریم میں کئی جگہوں پر قصے کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ ﴿فاقصص القصص لعلهم يتفكرون﴾ [اعراف:۱۷۶] ﴿نحن نقص عليك أحسن القصص﴾ [یوسف:۳]۔

قصہ کسی شکل میں ہو، ہر دور میں رہا ہے۔ قصوں سے انسان کا ربط نیا نہیں، انسان کی اس سے دلچسپی ازلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن کا آغاز مصوری، بت تراشی اور دیگر فنون لطیفہ سے پہلے ہوا۔

عبدالقادر سروری ''دنیائے افسانہ'' میں لکھتے ہیں:

''یہ دنیا کا سب سے قدیم فن ہے، جس زمانے میں مصوری، بت تراشی اور دیگر فنون لطیفہ مستور بلکہ خیال میں بھی دور تھے، افسانہ دنیا سے روشناس ہو چکا تھا، اور اپنے منتہائے پیدائش کو بوجوہ احسن پورا کر رہا تھا۔ یونانی نقطۂ نظر سے یہ فن شاعری اور موسیقی سے بھی زیادہ قدیم ہے، اس کی جہانگیری کا یہ حال ہے کہ کائنات کے کسی گوشے میں ایسی قوم کا پتہ نہیں چلتا جس کے کان قصوں سے ناآشنا ہوں۔''

عربی ادب میں اختصار اور ادبی خصوصیت کی وجہ سے اس کے لیے نوادر کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور متعدد مصنفین نے نوادر جمع کیے ہیں۔ ''قالی'' کی ''الامالی'' کے آخر میں ''کتاب النوادر'' کو بعض لوگوں نے ادب عربی کا لب لباب قرار دیا ہے۔ اور اس طرح کی متعدد کتب نوادر ہیں۔ عصر جاہلی میں عربوں کی مجالس ہوتی تھیں اور ان میں فروسیت، شجاعت، سخاوت اور مروت سے متعلق قصے سنائے جاتے تھے۔ بعض میں بہت معروف یا ناقابل یقین واقعات بھی ہوتے۔ المبرد نے اپنی کتاب ''الکامل'' میں "أکاذیب الأعراب" ایک عنوان قائم کیا ہے جس میں بعض ناقابل یقین واقعات بیان کیے ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں قصوں سے دلچسپی کے تذکرے ملتے ہیں۔ عباسی عہد میں ایک طبقہ قصاصین کا وجود میں آ گیا تھا۔

ان مختصر قصوں کے علاوہ طویل قصوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ فروسیت کے سلسلے میں عنترہ، سخاوت میں حاتم طائی، فتح و نصرت میں سیف بن ذی یزن اور آخر دور میں عیاری وشطاری میں مقامات اور پھر الف لیلۃ ولیلۃ کا عربی ادب میں تذکرہ ملتا ہے۔ مغربی ادب سے واقفیت اور استفادہ کے بعد انیسویں صدی سے عربی ادب میں قصہ نگاری نے نیا انداز بیان اختیار کیا۔ اور اخبار و رسائل سے اس صنف کو وسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان قصہ نگاروں نے سماج کو موضوع بنایا اور سماجی تبدیلی میں ان کا اہم حصہ ہے۔ مصطفی لطفی منفلوطی، ڈاکٹر طہ حسین، محمد حسین ہیکل، جبران خلیل جبران، محمد تیمور اور نجیب محفوظ سے ہندوستان کے لوگ واقف ہیں، اور ان میں سے اکثر کے قصے اردو میں ترجمہ کیے گئے اور مقبول ہوئے۔ نجیب محفوظ کو ان کی قصہ نگاری پر نوبل پرائز بھی دیا گیا۔

قدیم عہد میں قصوں کا مقصد تفریح طبع اور مسرت کا حصول تھا۔ عصر حاضر میں مغربی ادب کا اثر جس طرح زندگی کے مختلف شعبوں پر پڑا، ادب پر بھی پڑا، اور اس سے قصہ چاہے وہ مختصر قصہ ہو یا ناول، یا ڈرامہ، متاثر ہوا، اور اس کو ذہن سازی کا ذریعہ بنایا گیا۔

اردو ادب میں داستانوں اور ناولوں کے بعد افسانہ یا مختصر قصوں کا انیسویں صدی سے آغاز ہوا، جس میں تفریح کے ساتھ مقصدیت شامل ہوگئی، جو تعلیم و تربیت میں اہم عامل قرار پائی۔ ڈپٹی نذیر احمد، سرشار، شرر اور مرزا ہادی رسوا، یا منشی پریم چند یا بعد کے افسانہ اور ناول نگار سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر اور قدرت اللہ شہاب، انہوں نے سماج اور زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا۔ اس طرح قصے کے ذریعے ذہن سازی کا کام لیا جانے لگا۔ قصہ نگار نے سماج کو یا انفرادی زندگی کو اپنے تصور کے مطابق پیش کرنا شروع کیا۔

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

اسلامی قصہ: مقصدیت اور فنی حسن و جمال کا مظہر

(سورۂ یوسف کی روشنی میں)

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الأعظمی ندوی
مدیر البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء

کسی واقعہ کو دلچسپ اور خوبصورت شکل میں پیش کرنے کے لئے قصہ کی اصطلاح اہل ادب کے نزدیک مقبول و معروف ہے، اس کا بنیادی عنصر خیال اور وجدان کو قرار دینا بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن اس کے ساتھ مقصدیت کی روح اور فنی خصوصیات کا عکس پوری طرح نمایاں ہونا بھی ضروری ہے، اسلامی ادب میں قصہ کی اہمیت اور اس کے بنیادی کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا، سب سے پہلے خیال کی شیرازہ بندی کچھ اس طرح ہو کہ اس کے پڑھنے اور سننے کے لئے ایک سازگار فضا تیار ہوجائے، اور اس کے مثبت کردار سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ادبی اور معنوی فائدہ حاصل ہوسکے۔

اسلامی قصہ کی یہ خصوصیت بھی بہت اہم ہے کہ اس میں سچائی اور فنی افادیت کے ساتھ تعمیری پہلو پوری طرح نمایاں ہوتا ہے، اور بلند اخلاقی قدروں کی طرف ذہنوں کو مائل کرنے اور صحیح انسانی زندگی کی تعمیر کا جذبہ دل و دماغ میں پیوست ہوجاتا ہے، اسی کے ساتھ نفسیاتی، عقائدی اور تربیتی پہلو کا ایک مکمل نمونہ سامنے آتا ہے۔

یوں تو قرآن کریم میں مذکور سبھی قصوں کے اندر ادبی اور فنی خصوصیات نہایت مؤثر انداز میں پائی جاتی ہیں، اور ان کا تربیتی اور دعوتی عنصر پوری طرح نمایاں ہے، لیکن ان تمام مذکورہ قصوں میں حضرت یوسف بن یعقوب علیہ السلام کا قصہ اپنے ادبی اور فنی منہج کے لحاظ سے ایک معجزانہ شان رکھتا ہے، چنانچہ قصہ شروع ہونے سے پہلے کتاب مبین کی نشانیوں اور اس کو عربی زبان میں نازل کئے جانے کا حقیقت پسندانہ تذکرہ کرتے ہوئے تاکید کے ساتھ فرمایا گیا ہے: إنا أنزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون: بلاشبہ ہم نے کتاب مبین کو عربی زبان میں نازل کیا ہے، تاکہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں، اور اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام کا قصہ شروع ہوجاتا ہے، جس کو نہایت بلیغ پیرایہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قصہ کی ابتدا ہورہی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت کو اس قصہ کا محور قرار دیا گیا، اور ان کی زندگی کے تمام گوشوں کو شروع سے آخر تک انتہائی بلیغ اور ادب وفن کے ایک نادر و نایاب نمونہ کے طور پر پیش کرنا کسی بھی ادیب وفنان اور کسی بھی قادر الکلام صاحب قلم یا فن نگارش میں یکتائے روزگار کی استطاعت وطاقت سے باہر ہے۔

یوسف علیہ السلام کے شخصیت ہر طرح کے انسانی پہلوؤں سے عبارت ہے، اس میں غم بھی ہے اور خوشی بھی ہے، نا امیدی اور آزمائشوں کے سخت سے سخت تر حالات بھی ہیں، اور بھائیوں کی آزمائش، تاریک کنویں میں پھینکے جانے کی آزمائش

اور ایک تجارتی قافلہ کے ذریعہ کنویں سے نکالکر بازار مصر میں غلام کی حیثیت سے کوڑیوں کے مول بیچے جانے کی آزمائش، عزیز مصر کی بیوی کے حسن یوسف پر فدا ہونے کی آزمائش، جیل خانہ میں زندگی گذارنے کی آزمائش، اسی طرح وزیر خزانہ ہونے کی آزمائش جو دیگر آزمائشوں سے زیادہ سخت تھی، اس لئے کہ مالیات کی ذمہ داری اور اس کو صحیح طریقہ سے انجام دینا انسان کے لئے ایک بڑی آزمائش ہے، اسی کے ساتھ حکومت کی ذمہ داریوں کو نباہنا، قحط سالی کا سامنا کرنا، بھائیوں کا مدد حاصل کرنے کے لئے آنا وغیرہ، لیکن انہیں مسلسل آزمائشوں کے درمیان سے نکل کر بلند درجات کے حصول اور ان کے تقرب الی اللہ کا ذریعہ بننا، بھائیوں کا اپنے قصور کی معافی طلب کرنا، اور ان کا ممنون کرم ہونا، والد غمزدہ کی آنکھوں کا تارا بننا، اور اس خواب کی تعبیر عملی طور پر دیکھنے کی سعادت حاصل ہونا، جس میں شروع ہی سے ان کی بلند زندگی اور عزت وعظمت کا اشارہ پنہاں تھا، اور نبوی زندگی کے خط وخال کی بشارت ان کے اس کلام میں جو امتنان وتشکر اور دعاء کا مظہر ہے موجود ہے:

"رب قد آتيتني من الملك، و علمتني من تأويل الأحاديث، فاطر السموات والأرض أنت ولي في الدنيا والآخرة، توفني مسلما، وألحقني بالصالحين" (اے میرے پروردگا تو نے مجھے ایک سلطنت عطا کی ہے اور تو نے مجھے خواب علم دیا ہے، اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا وآخرت میں میرا ولی اور کارساز ہے۔ تو مجھے اسلام کی حالت میں اٹھا، اور نیکوں کی جماعت میں ملادے)

(سورہ یوسف:۱۰۱)

اور تمام آزمائشوں میں کامیابی کی کلید ان الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے۔ "إنه من يتق و يصبر، فإن الله لا يضيع أجر المحسنين" (بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیزگاری اور صبر کرے تو اللہ تعالی کسی نیکوکار کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔)

(یوسف:۹۰)

اب آیئے اس قصہ کو مختصراً قرآن کریم کے بیان کی روشنی میں سپرد قلم کرتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن کے تقریباً سات سال گذرنے پر ایک عجیب وغریب خواب دیکھا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۱ر ستارے اور چاند اور سورج ان کو سجدہ کر رہے ہیں، یہاں پر یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے عمر میں بڑے ۱۱ر بھائی تھے، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے چھوٹے بھائی بنیامین دوسری ماں سے تھے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس خواب کی اہمیت کو سمجھ لیا، اور اپنے محبوب بیٹے یوسف علیہ السلام سے اس کو راز رکھنے کا حکم دیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ راز کسی طرح افشاء (LEAK) ہوگیا، اور بھائیوں کے دل میں سخت حسد اور غیظ وغضب کے جذبات پیدا ہوئے، انہوں نے بہتر سمجھا کہ کسی طرح یوسف علیہ السلام کو راستہ سے ہٹادیں، اور یہ قصہ ہمیشہ کے لئے پاک ہوجائے، انہوں نے اس ارادہ پر عمل درآمد کرنے کے لئے ایک ایسی سازش تیار کی، جو ان کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرسکے۔

بھائیوں کی جماعت اپنے والد یعقوب علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئی، اور نہایت معصومی کے ساتھ انہوں نے عرض کیا کہ ابا جان! ہم نے کل آئندہ ایک کھیل کا پروگرام جنگل کے قریب میدان میں بنایا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ یوسف (علیہ السلام) بھی اس میں شریک ہوں، اور ہمارے ساتھ چلیں،

آپ اجازت دے دیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے بادل ناخواستہ اجازت تو دے دی، لیکن فرمایا کہ یوسف کی جدائیگی مجھے بہت شاق ہے، اور مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ اس بچے کو جنگل کے قریب کہیں بیٹھا کر تم کھیل میں مشغول ہو جاؤ، اور بھیڑیا اس کا شکار کر لے، صاحبزادگان نے عرض کیا کہ ابا جان! ہم اتنی بڑی جماعت ہیں، اگر یوسف کو ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا کھا جائے تو ہم سے زیادہ ناکام کون ہوسکتا ہے؟ آخر کار حضرت یعقوب علیہ السلام نے ڈرتے ڈرتے اجازت دی، بھائیوں نے پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ یوسف کو اپنے غیظ و غضب اور حسد کی آگ بجھانے کے لئے قتل کردیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: و أوحينا إليه لتنبئنهم بأمرهم هذا وهم لا يشعرون۔ ہم نے یوسف کے دل میں یہ بات ڈالی کہ گھبراؤ نہیں، تم ان کی اس حقیقت کی خبر مستقبل میں دو گے، جبکہ وہ اس سے بے خبر ہوں گے، اور یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش میں اپنے آپ کو کامیابی سے ہم کنار سمجھ چکے ہوں گے۔ (سورہ یوسف:۱۵)

رات ہوتے ہوتے روتے دھوتے اپنے والد کے پاس پہونچے، اور کہنے لگے: ابا جان! ہم دوڑ میں مقابلہ کر رہے تھے، اور یوسف کو اپنے سامانوں کے پاس بیٹھا دیا تھا، اتنے میں بھیڑیا آیا اور اس نے یوسف کو اپنا نوالہ بنالیا، اس خبر پر یقین دلانے کے لئے ان کے کرتے کو کسی اور جانور کے خون سے تر بتر کر کے لائے، اور اپنے والد کے سامنے اس کو پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہم کتنے ہی سچے ہوں، آپ ہماری بات پر یقین نہیں کر سکتے، انہوں نے کہا کہ یہ واقعہ غلط ہے، تمہارے نفسانی جذبات نے اس بات پر تمہیں آمادہ کیا کہ تم مجھ کو مطمئن کرنے کے لئے ایک جھوٹے واقعہ کو سچائی کا لباس پہنانے کی کوشش کرو، بہر حال صبر جمیل کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں، اور جو خبر تم دے رہے ہو، اس پر اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کی درخواست ہے-فصبر جميل والله المستعان على ما تصفون۔ (سورۃ یوسف:۱۸)

ادھر یوسف علیہ السلام کو ''قتل'' کرنے کے مشورہ کے بعد بعض بھائیوں کے مشورہ سے انھیں زندہ رکھا گیا، لیکن ان کو ایک تاریک اور بڑے کنویں میں ڈال دیا گیا، صبح کو جب ادھر سے ایک تجارتی قافلہ گذرا، اور انہوں نے پانی لینے کے لئے کنویں میں ڈول لٹکایا تو ان کو اچانک کنویں کی نچلی کگار پر ایک بچہ بیٹھا ہوا نظر آیا، انہوں نے آواز لگائی، مبارک ہو یہ خوشخبری، کنویں میں ایک خوبصورت بچہ بیٹھا ہوا ہے، اور اس کو ایک قیمتی سامان تجارت سمجھ کر چھپا دیا، ان کی ان حرکتوں کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہے تھے۔

آخر کار بازارِ مصر میں لے جا کر دوسرے سامان تجارت کی طرح اس بچہ کو بھی چند ٹکوں میں بیچ دیا، ان کو بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، خریدار اس قدر سستا مال پا کر اپنی بیگم سے مخاطب ہوا، اور کہا کہ یہ بچہ شریف النسل معلوم ہوتا ہے، اس کی دیکھ ریکھ کرو، امید ہے کہ وہ تمہارے لئے سود مند ہوگا، یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وكذلك مكنا ليوسف فى الأرض ولنعلمه من تأويل الأحاديث والله غالب على أمره ولكن أكثر الناس لايعلمون (یوسف: ۲۱) آخر کار اسی طرح رفتہ رفتہ ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کو جگہ دی، اور اس لئے بھی تا کہ ہم ان کو خوابوں اور واقعات کی تعبیر کا علم عطا کریں، اور اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی

مشکل کام نہ تھا، وہ اپنے تمام معاملات (امر و نہی) پر پوری طرح قادر ہے، اگرچہ بہت سے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

اب حضرت یوسف علیہ السلام جسم وعقل دونوں اعتبار سے پختہ ہوچکے ہیں، اور علم وحکمت، یعنی شریعت ونبوت کا علم حاصل کرنے اور اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے طریقے سے پوری طرح باخبر ہیں، یہ انعام تھا ان کی نیکیوں اور آزمائشوں سے صبر وتحمل کے ساتھ گذر جانے کا، لیکن ابھی ان کے تقویٰ کا امتحان باقی تھا، عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) نے موقع پاکر ان کو بہکانا چاہا، اور کمرے کے سارے دروازے بند کر کے ان کو اپنی طرف بلانے لگی، قریب تھا کہ حضرت یوسف کے پائے استقامت میں لغزش پیدا ہو جاتی، اگر انہوں نے اپنے رب کی نشانی نہ دیکھ لی ہوتی، جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی لغزش سے بچ گئے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے اور برگزیدہ بندے تھے، حضرت یوسف مین دروازہ (Main Door) کی طرف لپکے، زلیخا عزیز مصر کی بیوی ان کے پیچھے دوڑی، اور پیچھے سے ان کا کرتا پھاڑ دیا، دروازہ جوں ہی کھولا، تو عزیز مصر سامنے کھڑے ہوئے نظر آئے، ان کو دیکھتے ہی زلیخا نے دریافت کیا کہ: ایسے آدمی کی کیا سزا ہوسکتی ہے، جو آپ کی عزت وحرمت پر بری نیت سے حملہ آور ہو، اس سوال کا جواب خود ہی پیش کرتے ہوئے کہنے لگی کہ یا تو ان کو جیل کی ہوا کھلائی جائے یا کوئی تکلیف دہ سزا تجویز کی جائے۔

نہیں، نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا، بلکہ خود انہیں نے مجھ سے بری خواہش کا اظہار کیا، حضرت یوسف نے کہا۔

اور لگے ہاتھوں ایک خاندانی گواہ بھی سامنے آگیا، اور فیصلہ کن انداز میں اس نے کہا کہ اگر ان کا کرتا آگے سے پھٹا ہو تو زلیخا اپنے قول میں سچی ہے، اور یوسف جھوٹے ہیں، لیکن اگر کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو زلیخا جھوٹی ہے اور یوسف کی بات سچی ہے، اسی وقت عزیز خاوند نے چیک کیا تو کرتا پیچھے سے پھٹا پایا تھا، اور وہ بے ساختہ بول اٹھے کہ یہ تم عورتوں کی شرارت ہے، اور عورتوں کی شرارت۔ الامان الحفیظ۔

پھر یوسف کی طرف متوجہ ہو کر بولے! یوسف! اس قصہ کو نظر انداز کرو، اور اے زلیخا! اپنے گناہوں کی معافی مانگو، بلاشبہ تمہیں قصوروار ہو۔

ادھر شہر میں عورتوں کے ماحول میں اس واقعہ کا بڑا چرچا ہوا، ہر ایک نے دوسرے سے کہا: بہن! تمہیں معلوم ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام کے محبت میں فریفتہ ہو کر اور خواہش نفس سے مغلوب ہو کر کس طرح اس کو کمرہ میں بند کیا، یہ کتنی بے حیائی اور بے شرمی بات ہے۔

جب زلیخا نے ان کی اس بیباکانہ گفتگو کو سنا تو ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی، ان سب عورتوں کو اپنے گھر بلا بھیجا، اور ان کے لئے ایک محفل آراستہ کی اور دعوت طعام دی، اور ہر ایک کے سامنے پھلوں کی پلیٹیں (پیش کیں) اور سب کے ہاتھ میں ایک ایک چاقو دے دیا، اور یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے آنے کا حکم دیا، عورتیں ان کے حسن وجمال کو دیکھنے میں اس طرح بے خود ہوئیں کہ پھل کاٹنے کے بجائے انہوں نے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا، اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ سبحان اللہ! یہ تو ایک عظیم وکریم فرشتہ ہے۔

یہی وہ مرکز ثقل ہے، جس کے لئے تم نے میری طرف ملامت کے تیر پھینکے تھے، زلیخا نے کہا، بلاشبہ میں نے اس

فرشتہ کو بہلانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ بچ گیا، اگر اس نے میرے حکم کی تابعداری نہیں کی، تو جیل میں ڈالا جایا جائے گا، اور بے عزت ہوگا، حضرت یوسف نے دعا کی کہ اے میرے مولیٰ! جیل میرے لئے زیادہ پسندیدہ جگہ ہے، بنسبت اس فعل کے جس کی مجھے دعوت دی جارہی ہے، میرے اللہ! اگر آپ نے ان کے مکروفریب سے مجھ کو دور نہیں کیا، تو میں ان کی طرف مائل ہوجاؤں گا، اور میرا شمار جہالت کے علمبرداروں میں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، ان کی فریب کاریوں کو ان سے دور کر دیا، اور بیشک وہ دعاؤں کو سننے والا، اور دل کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ دعا قبول ہوچکی ہے۔ لیکن زلیخا کا مکر وفریب جاری ہے، اس عشق ناگہانی سے بچنے کے لئے ان کے خاندان کے لوگوں کو بہتر معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو گھر کے اندر قیام کرنے کے بجائے کچھ دنوں کے لئے جیل میں منتقل کر دیا جائے۔

اب یوسف علیہ السلام جیل جارہے ہیں، ان کے ساتھ دونوجوان اور بھی جیل کی سزا کاٹنے کے لئے ان کے ساتھ داخل ہوئے، جیل کی زندگی میں اپنے علم وحکمت کی بنا پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو عطا ہوتھا، سب کی نظروں میں محبوب اور معزز ہوگئے، ان دونوں نوجوانوں نے خواب دیکھا، ایک نے یہ دیکھا کہ میں انگور کی شراب بنارہا ہوں، دوسرے نے یہ خواب دیکھا کہ میں اپنے سر کے اوپر روٹیاں رکھے ہوا ہوں، اور پرندے اس کو کھارہے ہیں، دونوں نے یوسف (علیہ السلام) سے عرض کیا: آپ براہ کرام اس کی تعبیر ہم کو بتایئے، اس لئے کہ ہم آپ کو تعبیر دینے کا اہل سمجھتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع کو عقیدۂ توحید ورسالت کو پیش کرنے کے لئے غنیمت سمجھا، کہا کہ جیل سے تمہارا کھانا آنے سے پہلے میں تم کو تمہارے خواب کی تعبیر بتادوں گا۔ اس کا علم مجھ کو میرے پروردگار نے عطا کیا ہے، سنو! میں نے اس قوم کی ملت کو ترک کر دیا ہے، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان، آخرت پر یقین نہیں رکھتے، میں تو اپنے آباء واجداد کی ملت پر قائم ہوں، ان کا شمار انبیائے کرام میں تھا، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، ہم کو اجازت نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا ہم پر اور سبھی لوگوں پر، اور ناشکروں کی تعداد تو بے شمار ہے۔

اے میرے جیل کے ساتھیو! یہ بتاؤ کہ کیا بہت سے معبود بہتر ہیں یا ایک اللہ جو خالق وغالب ہے؟ اللہ کو چھوڑ کر جو لوگ مصنوعی خداؤں کو پوجتے ہیں، وہ صرف نام کے خدا ہیں، جن کو تم نے اور تمہارے آباواجداد نے خدا بنالیا ہے، اور اللہ کی طرف سے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ ان کا حکم ہے کہ صرف تم انہیں کی عبادت کرو، اور یہی متوازن دین اور سیدھا مذہب ہے، خواہ اس سے بہت سے لوگ واقف نہ ہوں۔

میرے جیل کے ساتھیو! اپنے خوابوں کی تعبیر سن لو! تم میں سے ایک اپنے آقا کو شراب پلائے گا، اور دوسرے کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا، اور پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ تم دونوں کے خواب کی یہی تعبیر ہے۔

ان دونوں ساتھیوں میں جس کے بارے میں ان کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ جلد ہی جیل سے رہا ہوجائے گا، حضرت یوسف نے اس سے کہا: یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا، لیکن نکلنے کے بعد اس کو شیطان نے یہ بات بھلادی کہ

وہ اپنے آقا سے یوسف علیہ السلام کا ذکر کر کے قید سے نجات دلائے، اس طرح وہ کئی سال تک جیل میں رہ گئے۔

دوسری جانب بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات بالیاں سرسبز ہیں اور بقیہ خشک ہیں، اے درباریو! مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ، اگر تم تعبیر کا علم رکھتے ہو، سب نے کہا کہ یہ پریشان خیالی ہے، اور ہم پریشان خیالی کے تعبیر سے واقف نہیں ہیں، جیل کے دونوں ساتھیوں میں سے جو چھوٹ کر آیا تھا اور دربار میں بیٹھا ہوا تھا ایک عرصہ کے بعد اس کو اپنے خواب کی تعبیر یاد آئی، اس نے کہا کہ میں اس خواب کی تعبیر تم کو بتاؤں گا، مگر شرط ہے کہ تم مجھے جیل میں یوسف (علیہ السلام) سے ملنے کی اجازت دو۔

اجازت مل جاتی ہے، اور جیل میں پہونچ کر وہ حضرت یوسف سے ملاقات کرتا ہے، سلام و تعارف کے بعد وہ اس طرح گویا ہوتا ہے، اے سچے یوسف! ذرا اس خواب کی تعبیر بتاؤ، سات موٹی گائیں ان کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں، اور سب خشک ہیں، ممکن ہے کہ میں اس خواب کی تعبیر لیکر بادشاہ اور درباریوں کے پاس جاؤں اور ان کو وہ تعبیر معلوم ہو جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر اس طرح بتا رہے ہیں: سات سال تک تم مسلسل زراعت کرتے رہو گے، فصل تیار ہونے کے بعد جب اسے کاٹو تو اس کو بالیوں ہی کے اندر چھوڑ دو، اور اپنے کھانے کے لئے مناسب مقدار میں نکال لو، پھر اس کے بعد قحط کے سات سال سخت ہوں گے، اور جو کچھ تم نے بچا کر رکھا ہوگا وہ سب کھا جاؤ گے، سوائے ایک قلیل مقدار کے جس کو تم نے بچا کر رکھا ہے، پھر اس کے بعد خوشحالی کا ایک سال ایسا آئے گا کہ اس میں لوگوں کی من جانب اللہ مدد کی جائے گی، اور اس سال میں لوگ انگور کا شیرہ نچوڑیں گے۔

اب بفضل خداوندی یوسف علیہ السلام کے عروج کا دور شروع ہوتا ہے، بادشاہ مصر ریان بن الولید، اپنے خواب کی تعبیر براہ راست معلوم کرنا چاہتا ہے، جیل سے رہائی اور دربار میں حاضری کی امید پیدا ہو چلی، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام اس رہائی کو اس وقت تک قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جب تک ان کو زلیخا کی سہیلیوں کے ہاتھ کاٹنے کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے، بادشاہ نے ان سہیلیوں سے یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کی کیا حقیقت ہے، ”حاشا وکلا! ہم نے یوسف کے اندر کوئی برائی نہیں دیکھی“ سہیلیوں نے جواب دیا، اور اسی وقت عزیز مصر کی بیوی نے بات صاف کر دی اور کہا: اب سچائی کھل گئی، میں نے خود ان کو ورغلایا تھا، وہ بالکل سچے ہیں، حضرت یوسفؑ نے کہا کہ یہ بات میں نے صرف اس غرض سے کہی کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے ان کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی ہے، اور ظاہر ہے کہ خیانت کا فریب کبھی کارآمد نہیں ہوتا، میں یہ دعوی بھی نہیں کرتا کہ میں نفس کے عیب سے پاک ہوں، نفس تو برائی کا سب سے بڑا داعی ہے، ان شاء اللہ، اور اللہ تعالیٰ کے خزانے میں رحم و مغفرت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

بادشاہ گویا ہوئے: یوسف کو میرے پاس لاؤ، میں ان کو اپنا خاص آدمی بنالوں گا، حضرت یوسفؑ آئے، بادشاہ نے ان سے بات کی اور کہا کہ تم یقینی طور پر آج سے میرے خاص مددگار اور معتبر ہو گئے، حضرت یوسفؑ نے کہا کہ مجھے ملک کے

خزانوں کا پاسبان بنا دیجئے، میں انشاء اللہ تعالیٰ ان کی خوب حفاظت کرنے کے فن سے واقف ہوں۔

ان تمام مرحلوں کے بعد یوسف علیہ السلام کو ملک کے خزانوں پر پورا قابو حاصل ہو گیا، جہاں چاہتے اپنا ٹھکانا بناتے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے جس کو جو چاہیں عطا کر دیں، احسان کا بدلہ کبھی ضائع نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ اہل ایمان و تقویٰ کے لئے آخرت کا اجر بہت قیمتی اور بہتر چیز ہے۔

پھر قحط کی شدت ہوتی ہے، حضرت یوسفؑ کے بھائی وزیر خزانہ کے پاس طالب مدد ہو کر آتے ہیں، ان کو وہ خوب پہچان لیتے ہیں، لیکن بھائیوں کو اس کا ادراک نہیں ہو پاتا کہ وزیر خزانہ یوسف علیہ السلام ہیں، انہوں نے درخواست منظور کر لی اور ان کی بھرپور مدد کی، اور یہ بھی کہا کہ تم اپنے سوتیلے بھائی کو بھی لاؤ، تاکہ مزید تمہارے لئے سامان زندگی کا انتظام ہو سکے، اگر تم یہ نہ کر سکو تو پھر آنے کی ضرورت نہیں ہے، بھائیوں نے کہا کہ ہم ان کے والد سے درخواست کریں گے اور ان کی اجازت کے بعد ہم ضرور ان کو لیکر آئیں گے۔ اس کے لئے ایک ترکیب حضرت یوسفؑ کے ذہن میں آئی، انہوں نے غلے کی جو قیمت ادا کی تھی چپکے سے ان کے سامانوں میں رکھوا دی، تاکہ گھر پہونچ کر جب وہ دیکھیں تو پھر یقیناً اپنے ساتھ لانے کی کوشش کریں گے..... آخرکار حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو بھائیوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور وصیت کر دی کہ شہر میں تم لوگ الگ الگ دروازوں اور راستوں سے داخل ہونا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو پا کر بے حد خوش ہوئے اور ان کو بتا دیا کہ میں یوسف ہوں، تم ذرا بھی غم نہ کھانا اور نہ ان لوگوں کی حرکتوں سے متاثر ہونا انہوں نیا پنے بھائی بنیامین کو روکنے کے لئے ایک دوسری ترکیب کی، ایک قیمتی پیالہ جس سے پانی پینے کا کام لیا جاتا تھا، ان کے سامانوں میں رکھوا دیا، اور جب بھائیوں کا قافلہ روانہ ہوا تو ان کے راستے میں آواز لگائی گئی: اے قافلے والو! تم نے چوری کی ہے، انہوں نے تعجب سے پوچھا: کون سی چیز چوری ہوئی ہے: آواز آئی کہ بادشاہ کا پیالہ جو پیانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جو کوئی اس کو لائے گا اس کو مزید ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ دیا جائے گا، بھائیوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم زمین میں فساد پھیلانے کے لئے نہیں آئے ہیں اور نہ ہمارا چوروں سے کوئی تعلق ہے۔

لیکن سامان کی جانچ کی گئی تو بالآخر بنیامین کے اسباب میں وہ پیالہ ملا، بادشاہ کے خدمت گذاروں نے بنیامین کو واپس لانے کی یہ ترتیب کی، ورنہ بادشاہ کو قانونی اعتبار سے ان کو روکنے کا کوئی حق نہیں تھا، یہ تدبیر منجانب اللہ تھی، اور رفع درجات کا ذریعہ بھی، اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نرفع درجات من نشاء، جس کا مرتبہ ہم بلند کرنا چاہتے ہیں بلند کرتے ہیں، اور ہر ذی علم سے اوپر ایک دوسرا جاننے والا بھی ہے، پھر ایک موقع ملا اور اب بھائیوں نے کہنا شروع کیا کہ اگر انہوں نے چوری کی، تو اس سے پہلے ان کے ایک بھائی نے چوری کی تھی، اس بات کو سن کر حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کر لیا، اور ان کے سامنے کوئی اشارہ و کنایہ بھی نہیں کیا، صرف یہ کہا کہ تم اپنے منصب کو پہچان نہ سکے، اور تمہاری باتوں سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے۔

پھر کہنے لگے: عزیز مصر! اس بھائی کے ایک بوڑھے

باپ ہیں، اس لئے ہم میں سے کسی کو آپ اس کی جگہ پر روک لیجئے، ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں، حضرت یوسفؑ نے کہا: اللہ کی پناہ! ہم تو اسی کو پکڑیں گے، جس کے پاس ہمارا سامان ملا ہے، ورنہ اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا، جب ان سے امیدیں منقطع ہوگئیں آپس میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، ان کے بڑے بھائی نے کہا کہ کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ تمہارے والد نے تم سے عہد لیا ہے اللہ کے نام سے، اس سے پہلے جو قصور یوسف کے بارے میں کر چکے ہو، وہ سب کو معلوم ہے، میں یہاں سے ہرگز ٹلوں گا نہیں، جب تک کہ میرے والد کی طرف سے مجھے اجازت نہ مل جائے، یا اللہ تعالیٰ أحکم الحاکمین کی طرف سے تمہارے لئے کوئی فیصلہ ہو جائے، فوراً واپس جاؤ، اور اپنے والد کو بتاؤ کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی، ہم کو اس کا کچھ پتہ نہیں تھا، اور نہ ہم غیب کی باتوں سے واقفیت رکھتے ہیں، اگر وہ چاہیں تو اس بستی سے پوچھ سکتے ہیں، اور اس قافلہ سے بھی دریافت کر سکتے ہیں، جس میں ہم شریک تھے، ہم بیشک سچ بولنے والے اور سچ کی پیروی کرنے والے ہیں، والد نے کہا: تم نے ایک بات اپنی طبیعت سے گھڑ لی ہے، تو سوائے صبر کے اب کوئی چارۂ کار نہیں، مجھے پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ تک پہونچائیں گے، ان سے زیادہ واقف اور باحکمت کوئی نہیں۔

اور ان سے رخ پھیر کر کچھ اس طرح گویا ہوئے: ہائے افسوس: یوسف، یہ دوسری چوٹ تھی جو دل پر اثر انداز ہوئی، اور بقول شاعر:

ع بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ

اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام کی جدائی کا غم بھی تازہ ہو گیا، اور رنج و غم اور حزن و ملال سے رو رو کر حضرت یعقوب کی آنکھیں سفید ہو گئیں، اس روح فرسا صدمے نے یعقوب علیہ السلام کو بے حال کر دیا تھا، اس کے باوجود کوئی حرف شکایت ان کی زبان پر نہیں آیا، بلکہ سارا غم آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کی شکل میں گر گر کر گریبان تر کر دیا کرتا تھا، اور ایسا بھی نہیں تھا کہ یوسف علیہ السلام کے فراق میں رو رو کر زندگی نہ گذارتے ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں گڑگڑا کر یوسف علیہ السلام کی واپسی کی دعائیں نہ مانگتے ہوں، رنج و غم کی یہی وہ حالت تھی، جس نے ان کی بصارت کو کمزور کر دیا، لیکن نور بصیرت میں برابر اضافہ ہوتا رہا، بنیامین کی جدائی کی نئی مصیبت ان کے سامنے آئی تو بے اختیار ''ہائے یوسف'' ان کی زبان سے نکل کر رہ گیا، اتنی طویل مدت تک درد دل کو دبا کر رکھنا، کہیں اس کا ذکر و تذکرہ اور اشارہ بھی نہ کرنا اور اس نئی مصیبت پر ہائے افسوس کر کے رہ جانا اور یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی یاد آجانا، کسی عام انسان کے بس کا کام نہیں ہے، یہ امتیاز تو انہیں برگزیدہ ہستیوں کو حاصل ہے، جن کو انبیاء و رسل کے منصب عظیم سے نوازا گیا تھا۔

یہی وہ موقع تھا جب صاحبزادوں نے کہنا شروع کیا: بخدا آپ یوسفؑ کو برابر یاد کرتے رہیں گے، اور اپنے جسم و جان کو گھلاتے رہیں گے، یا انہیں یاد کرتے کرتے زندگی کی نعمت سے محروم ہو جائیں گے، جواب میں حضرت یعقوبؑ نے کہا: عزیزو! تمہیں کیا معلوم، میں تو اپنا درد و غم اللہ ہی کے سامنے پیش کرتا ہوں، مجھے اللہ نے جو علم دیا ہے تم اس سے محروم ہو، ابھی امید کی چنگاری حضرت یعقوبؑ کے دل کے ایک گوشے میں روشن تھی، اور ناامیدی کے دامن کو جھٹکتے ہوئے،

بیٹوں کی طرف مخاطب ہوئے: جاؤ، تلاش کرو، یوسف اوران کے بھائی کا کھوج لگاؤ، اوراللہ کے فیض رحمت سے مایوس ہونا ہمیں زیب نہیں دیتا، مایوسی کفر کے دامن کے ساتھ وابستہ ہے، جاؤ، کوشش کرو، یوسف اوران کے بھائی کا کھوج لگاؤ، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کوایک ساتھ پردۂ غیب سے نکال دے۔

اب بیٹوں کا یہ قافلہ عزیز مصر کے دربار میں حاضر ہوا، اور کہنا شروع کیا: اے عزیز! ہمارے اور ہمارے گھر کے لوگوں پر بڑا سخت وقت آیا ہے، ہم ایک معمولی پونچی لے کر آئے ہیں، اس امید میں کہ آپ ہمیں خیرات کے ذریعہ سے بھرپور غلہ عطا فرمادیجئے، خیرات کرنے والوں کا اللہ کی نظر میں بلند مقام ہے، خیرات کا نام لیتے ہی عزیز مصر جو یوسف علیہ السلام تھے، کھلے اور کہنے لگے کہ: تم کو کچھ خبر بھی ہے کہ تم نے یوسف اوران کے بھائی بنیامین کے ساتھ کیا کیا کیا، تم سمجھ رہے تھے کہ دونوں بھائیوں کا مستقبل تاریک ہوگیا، لیکن تم کواس روشن مستقبل کا علم نہ تھا، بھائیوں نے کہنا شروع کیا: اوہ ہو! کیا آپ ہی یوسف ہیں؟! جی ہاں! میں ہی یوسف ہوں، یہ میرا بھائی ہے، یوسف علیہ السلام نے جواب دیا، اللہ نے ہمارے اوپر زبردست احسان فرمایا، جان لو! جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے، اور صبر سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے، بھائی بے اختیار بول اٹھے: واللہ العظیم! اللہ نے تم کو اپنا بنالیا، اور ہم پر تم کو ترجیح دی، حالانکہ ہمیں قصوروار تھے، حضرت یوسفؑ نے جواب میں کہا: تم لوگوں پر آج کوئی الزام نہیں، اللہ تمہاری خطاؤں کو بخش دیں اور وہ ارحم الراحمین ہیں، دیکھو یہ میرا کرتا لے جاؤ اوراس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو، انشاء اللہ ان کی بصارت لوٹ آئے گی، اوراب میری تم سے ایک درخواست ہے کہ اپنے گھر کے تمام افراد کو یہاں لے کر آؤ۔

ادھر یہ لوگ خوشیاں مناتے ہوئے اپنے قافلے کو لیکر اپنے گھر کی طرف لوٹے، ادھر یعقوب علیہ السلام نے کہا: مجھے یوسف کی خوشبو محسوس ہورہی ہے اگر تم مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو، گھر والوں نے کہا: قسم اللہ کی آپ اپنے اسی پرانے غم میں بتلا ہیں، لیکن خوشخبری آنے کے ساتھ ہی اور یوسف علیہ السلام کی کرتے کی خوشبو ناک میں پہونچتے ہی بلا تاخیر ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں، اس وقت انہوں نے اپنی سابقہ بات یاد دلائی کہ مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے، جس سے تم محروم ہو، بیٹوں نے بے اختیار اپنے قصوروں کی معافی مانگنی شروع کردی، اوراقرار کرتے رہے کہ ہم سے خطا ہوئی، یعقوب علیہ السلام نے ان کی درخواست قبول کر لی، اور کہا کہ یقیناً میں تمہارے لئے اپنے رب سے معافی کی درخواست کروں گا، وہ بلاشبہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

اب مرحلہ شروع ہوتا ہے یوسف علیہ السلام کے والدین اوران کے افراد خاندان کے مصر کی طرف روانگی، اور وہاں عزیز مصر کے ساتھ قیام کرنے اورامن وامان کی زندگی گذارنے کا، یوسف علیہ السلام کے کرتے کی خوشبو سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت اللہ کے حکم سے واپس آچکی ہے، بھائیوں نے بھی اس بات پر نکیر کی اور کہنے لگے کہ آپ اپنے اسی پرانی روش پر ابھی بھی چل رہے ہیں، یعنی یوسف علیہ السلام کی محبت، ان کے زندہ رہنے اور دوبارہ ملنے کا یقین آپ کے دل میں رچ بس گیا ہے، ادھر حال یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کی کرتے کی

خوشبو جونہی ان کے مشام جاں سے ٹکرائی، بینائی واپس آگئی، یہ دیکھ کر سبھی حیران وششدر رہ گئے، اس وقت حضرت یعقوبؑ بول اٹھے: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے جو بات معلوم ہے، اس کا علم تم کو نہیں ہے، اب سوائے غلطی کا اعتراف کرنے اور معافی مانگنے کے کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا، یعقوب علیہ السلام نے بلا تاخیر کہا کہ میں اپنے رب سے تمہارے گناہوں کی معافی طلب کروں گا، اس لئے کہ وہ بہت زیادہ معاف کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

جب والدین اور اہل خاندان حضرت یوسفؑ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے مصر پہونچے تو وہاں یوسف علیہ السلام نے ان کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا، اور ان لوگوں کو نہایت اعزاز کے ساتھ ٹھہرایا، اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: نہایت امن وامان اور دلجمعی کے ساتھ مصر میں قیام کیجئے، اسی موقع پر یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر عملی طور پر ظاہر ہوتی ہے، جب وہ اپنے والدین کو تخت کی بلندیوں پر بٹھاتے ہیں اور سب کے سب ان کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں، یہ رمز تھا والدین اور ان کے ساتھ آنے والوں کی تکریم وتعظیم کا، اور اس پیشین گوئی کے پوری ہونے کی ساعت تھی، جو حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کو سن کر انہوں نے کی تھی کہ تمہارے رب تم کو برگزیدہ کرلیں گے، یعنی اپنی بارہ گاہ قرب میں تم کو خصوصی مقام عطا فرمائیں گے، چنانچہ یہ پیشین گوئی آج پوری ہورہی ہے، یوسف علیہ السلام نہ صرف برگزیدہ نبی ہوئے بلکہ مصر کے پایۂ تخت کے مالک بھی ہوئے، اس وقت ان کو والد مکرم کی یہ بات یاد آئی، کہنے لگے: ابا جان! اس قدیم خواب کی تعبیر آج ظاہر ہورہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو سچ کر دکھایا، اور میرے اوپر انعامات کی بارش کی، مجھے قید سے نکالا، آپ کے یہاں آنے کی راہ ہموار ہوئی اور گاؤں کی فضا سے آپ نکلے، شیطان نے ہمارے اور بھائیوں کے درمیان جھگڑا پیدا کر دیا تھا، آج وہ ہماری مسرت میں شانہ بہ شانہ شریک ہیں، اللہ تعالیٰ کی تدبیر کو کون سمجھ سکتا ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے، ان جیسا باخبر اور حکمت والا کون ہوسکتا ہے۔

اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے بے اختیار اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر ان کے احسانات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ دعا پڑھی، اے میرے رب! آپ ہی نے مجھ کو سلطنت عطا کی، آپ ہی نے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا، اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے! آپ ہی میرے مددگار و کارساز ہیں، دنیا وآخرت میں ہر جگہ بس آپ سے یہی التجا ہے کہ حالت اسلام میں میری موت ہو، اور صالحین کی رفاقت عطا کی جائے۔

شکر وامتنان کے جذبات سے لبریز یوسف علیہ السلام کی اس دعاء پر قصہ کا خاتمہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: اس واقعہ کو پردۂ غیب سے باہر نکال کر ہم نے آپ کو اس سے باخبر کیا، جب اس واقعہ کے سلسلے میں بھائیوں کا اتفاق رائے ہوا تو آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے، ظاہر ہے کہ مشورے اور تدبیروں میں آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے کہ ان کی باتیں سنتے اور حالات کا بچشم خود معائنہ کرتے، اور جائزہ لیتے۔

یوسف علیہ السلام کا قصہ نہ صرف ان کے بچپن سے لیکر اخیر تک کے احوال وکوائف پر مشتمل ہے اور نہ وہ صرف ایک انسان کی زندگی کے حالات سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ یہ قصہ

اخلاقی عظمت اور علوم ومعارف کا ایک عظیم باب ہے، اس میں حکمت وبلاغت اور فنی اسلوب کا ایک دریا موجزن ہے، عفت وصداقت کا کردار اور صبر واستقامت کا ایک پہاڑ ہے، جو عداوت وحسد اور بغض وعناد کے جراثیم کو مٹا کر محبت والفت اور اعتماد واعتبار کا سلیقہ عطا کرتا ہے، اور حیات انسانی کے لئے اس میں درس عبرت کے ساتھ کامیابی اور بہتر سے بہتر انجام کی راہ ہموار کرتا ہے۔

سلام ہو ان پاک روحوں پر جو اس قرآنی قصے کے ہیرو بنے اور درود وصلاۃ ہو اس نبی برحق پر جن کو اللہ تعالیٰ نے براہ وحی یہ عبرتناک اور عقیدہ وایمان سے لبریز یہ قصہ سنایا۔

بقیہ سکریٹری رپورٹ

ان میں ایسے اہل قلم بھی تھے جو واقعہ نگار تھے، مگر ان کا مقصد سماج کی تصویر پیش کرنا تھا۔ کچھ ایسے بھی اہل قلم تھے جو بہتر زندگی کی ترغیب اور تلقین کے لیے قصے کو ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں نے تاریخ کو موضوع بنایا۔ اس لیے کہ تاریخ سے قومیں سبق لیتی ہیں اور اپنے حال اور مستقبل کی تشکیل میں مدد لیتی ہیں۔

اردو ادب میں قصہ نگاروں کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں مصلحین بھی ہیں اور واقعہ نگار بھی، اور مغربی افکار ونظریات اور رجحانات کے داعی بھی۔ کمیونزم کے دور میں ترقی پسند ادیبوں نے سماج کی قدروں اور نظام کے بارے میں نئے تصورات پیش کیے، بعض کی تحریروں میں دین اور خاص طور پر اسلام کو نشانہ بنایا گیا۔ بعض قصہ نگاروں نے اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر کے مغرب کے مادی تصور حیات کو پیش کیا۔

اس دور میں اسلام پسند ادیبوں نے اخلاق اور عقائد کے احترام کو باقی رکھنے اور ان کی ترغیب کے لیے قصے کو ذریعہ بنایا۔ قدیم تاریخ کا مغرب کے اہل قلم نے جس طرح مذاق اڑایا اور اس میں تحریف اور تزویر سے کام لیا، ان قصہ نگاروں نے قدیم اسلامی تاریخ اور تاریخ کی اہم شخصیتوں اور حکمرانوں کو عزت کا مقام عطا کرنے کے لیے اور نئی نسل کو شرمندہ ہونے سے بچانے کے لیے قصوں اور ناولوں کا سہارا لیا۔

ہمارے اس سیمینار کا یہی موضوع ہے۔ اس میں اردو ادب میں قصہ نگاری کے جائزے کے لیے ایسی ادبی شخصیتوں اور کاوشوں کا خاص طور سے جائزہ لیا جائے گا جنھوں نے قصہ نگاری کے میدان میں اہم مقام حاصل کیا، اور ان شخصیات کا خاص طور پر ذکر کیا جائے گا جنھوں نے ادب کو اور خاص طور سے قصے کو تعمیر کا ذریعہ بنایا اور جن کو اس التزام کی وجہ سے آزاد ادبی حلقوں نے نظر انداز کیا۔

ہمیں خوشی ہے کہ اس موقع پر بعض معروف ادبی شخصیتیں جمع ہوگئی ہیں، ہم ان کا استقبال کرتے ہیں، ایک روزہ سیمنار اس اہم موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے ناکافی ہے، اسی لئے دعوت نامے محدود پیمانے پر ارسال کئے گئے، امید ہے کہ کسی دوسرے موقع پر وسیع پیمانے پر سیمنار منعقد کیا جائے گا۔ شکریہ۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆

اردو میں قصہ نگاری
اسلامی ادب کے حوالے سے

محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (نائب ناظم امارت شرعیہ)

انسان بنیادی طور پر قصہ گو واقع ہوا ہے۔ زمانۂ قدیم میں دن بھر کی معاشی جدوجہد کے بعد تھکا ہارا انسان جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھتا تو دن بھر کے واقعات مزے لے لے کر سناتا اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتا۔ اس طرح قصہ گو کی نفسیات کو تسکین ملتی اور سامعین بھی جب مجلس سے اٹھتے تو دن بھر کی تھکان بھول جاتے۔ دھیرے دھیرے قصہ گوئی نے ایک فن کی حیثیت حاصل کرلی، اور شعراء کے اشعار کی طرح قصہ نے بھی جغرافیائی حدوں کو توڑ کر ملکوں ملکوں کا سفر کیا اور سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی گئی، ہمارے گھروں میں دادی ماں اور نانی ماں کے ذریعہ یہ قصے ہم تک پہنچے، جدید ذرائع ابلاغ نے گو قصہ گوئی اور قصوں کی سماعت کی روایت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن آج بھی وہ دیہات جہاں صنعتی انقلاب نے اپنے پاؤں نہیں پھیلائے ہیں اور وہ علاقے جو بجلی کی سہولیات سے آج بھی محروم ہیں وہاں برگد کے پیڑ کے نیچے چوپال لگتی ہے اور بچے دادی ماں سے قصہ سنانے کی ضد کیا کرتے ہیں، اس طرح دیکھا جائے تو قصہ گوئی نئی چیز نہیں ہے۔ علی عباس حسینی نے لکھا ہے:

"قصہ کی ابتداء وہیں سے ہوتی ہے جب ابن آدم مدنیت وعمرانیت کے پہلے زینہ پر ملتا ہے......وہ دس دس بیس بیس کی ٹولیوں میں ایک ساتھ رہتا ہے، وہ پیٹ بھرنے کے لئے اپنے سے کمزور جانوروں کا شکار کرتا ہے اور شام کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر ایک دوسرے سے دن کے واقعات ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بیان کرتا ہے، جہاں الفاظ کا سرمایہ کم پڑتا ہے وہ مسرت وغم، فتح وشکست، خوف وتہور کے جذبات کو حرکات سے ظاہر کرتا ہے۔" (ناول کی تاریخ اور تنقید ص ۳)

زمانۂ قدیم میں قصہ کے موضوعات غیر معمولی واقعات، خونیں حادثات جنگ کے احوال، دہشت وہیبت، اسرار ورموز، افسون اور بھوت پریت کے قصے، پریوں کے افسانے، عورت اور عشق نیز جانوروں کے احوال ہوا کرتے تھے، ہندوستان کے قدیم قصوں کو دیکھیں تو ان کے موضوعات بھی یہی کچھ ہیں۔ پھر قصہ گو کے قصے محفوظ ہوجائیں اس کے لئے انہیں ڈائری، روزنامچے وغیرہ میں محفوظ کیا جانے لگا تاکہ مرور زمانہ سے یہ قصے ناپید نہ ہوجائیں اور آنے والی نسل کے لئے تاریخی اور واقعاتی طور پر اسے محفوظ رکھا جاسکے۔ اس احساس نے قصہ نگاری کے فن کو رواج بخشا، شروع میں یہ قصے انتہائی سادہ ہوتے تھے، ان میں واقعاتی تسلسل ہوتا تھا، صنعت واستعارہ، فصاحت وبلاغت سے خالی یہ قصے دل سے نکلتے اور دل تک پہنچتے تھے۔

سب سے پہلا قصہ جو اس روئے زمین پر وجود میں آیا وہ اس پہلے انسان کا قصہ ہے جسے قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ پھر کار جہاں دراز ہوتا گیا، ابلیسی طاقتوں نے جب جب سر اٹھایا انبیاء کرام بھیجے گئے اور ان کی

حیات مبارکہ کو قرآن میں ذکر کیا گیا۔اس صنف کی پاکیزگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو احسن القصص کہا اور قصہ گوئی کی نسبت اپنی ذات کی طرف کیا۔

ارشاد ربانی ہے "نحن نقص عليك احسن القصص بمااوحينا اليك هٰذاالقرآن وان كنت من قبله لمن الغٰفلين" (یوسف ۱۲:۳) (ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک نہایت اچھا قصہ (واقعہ) سناتے ہیں اورتم اس سے پہلے بےخبر تھے) منهم من قصصنا عليك ورسلاًقد قصصنا عليك من قبل (النساء ۴:۱۶۴)،تلك القرى نقص عليك من انباء ها (الاعراف ۷:۱۰۱) كلانقص عليك من انباء الرسل (هود ۱۱:۱۲۰)، نحن نقص عليك نبأهم بالحق (الكهف ۱۸:۱۳)، كذالك نقص عليك من انباء ماقد سبق (طٰه ۲۰:۹۹)، ذالك من انباء القرى نقصه عليك (الانعام ۶:۱۰۰) جیسی آیات اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، ان قصوں کے موضوعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> "قرآن مجید کے قصص وواقعات کا سلسلہ بیش تر گزشتہ امتوں اوران کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اور جستہ جستہ بعض واقعات بھی اس ضمن میں آگئے ہیں اور یہ تمام ترحق وباطل کے مجادلوں اور اولیاء اللہ اوراولیاء شیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز و بےمثل ذخیرہ ہے۔"

(قصص القرآن ص ۸)

یہاں ہمیں یہ بات بھی یادرکھنی چاہئے کہ قرآن کریم میں جو قصے مذکور ہیں وہ صرف عبرت حاصل کرنے کے لئے ہیں، اسی لئے قرآن کریم کے قصص میں واقعاتی اور تاریخی تسلسل ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ جتنے حصے کی ضرورت جہاں سمجھی گئی، ذکر کیا گیا، اعادہ کی ضرورت ہوئی تو مکرر ذکر کیا گیا۔

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ لکھتے ہیں:

> "اسی لئے ان قصوں کے بیان میں واقعاتی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی، بعض جگہ قصہ کا ابتدائی حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے ذکر کردیا گیا، اس خاص اسلوب قرآنی میں یہ مستقل ہدایت ہے کہ دنیا کی تاریخ اوراس کے گذشتہ واقعات کا پڑھنا، یادرکھنا خود کوئی مقصد نہیں بلکہ انسان کا مقصد ہر قصہ وخبر سے کوئی عبرت ونصیحت حاصل کرنا ہونا چاہئے۔"

(معارف القرآن ج ۵ ص ۱۶)

قرآن کریم میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے قصہ کا مقصد عبرت کا حصول قرار دیا، ارشاد فرمایا: لقد كان فى قصصهم عبرة لاولى الالباب (یوسف ۱۲:۱۱۱) غور وفکر نیز عبرت وموعظت کے بنیادی مقصد کے حصول کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے قصہ بیان کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: فاقصص القصص لعلهم يتفكرون (الاعراف ۷:۱۷۶)

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اسلام میں قصہ نگاری کی اہمیت محض اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ہے، ایسے قصے جن کی وجہ سے انسان کے اندر خود شناسی اور خداشناسی پیدا ہوسکے، عبرت وموعظت کے لئے مفید ہو اور انسان کو اعلیٰ اخلاقی قدروں سے روشناس کراسکے، اسلام اس کو پسند کرتا ہے

بلکہ کہنا چاہئے کہ اسی نے اس کی طرح ڈالی ہے۔ مقصد کے حصول کے لئے قصہ میں جس ہیئت کا سہارا لیا جاتا ہے، ان کی حیثیت ثانوی ہے، قصہ سے اگر مقصدیت فوت ہوجائے تو یہ صرف وقت گذاری بلکہ وقت کی بربادی کا ذریعہ رہ جاتا ہے لکھنے والوں کے لئے بھی اور پڑھنے والوں کے لئے بھی منشی پریم چند نے بجا لکھا ہے کہ:

"ادیب کا کام صرف قارئین کا دل بہلانا نہیں ہے، یہ تو بھانڈوں، مداریوں اور مسخروں کا کام ہے، ادیب کا منصب اس سے کہیں اونچا ہے، وہ ہمارا رہنما ہوتا ہے، وہ ہماری انسانیت کو جگاتا ہے، ہم میں نیک خواہشات جاری کرتا ہے، ہماری نظر میں وسعت دیتا ہے، کم سے کم اس کا یہی مقصد ہونا چاہئے۔"

قصہ نگاری کا یہ فن جب اور ترقی پذیر ہوا تو واقعات کی نگارش میں قصہ نگار کے اپنے خیالات ونظریات، سماجی وسیاسی حالات کا ذکر بھی ہونے لگا۔ اور دھیرے دھیرے اسلام کے مطلوبہ مقاصد سے انحراف اور صرف نظر کیا جانے لگا۔ اس طرح قصہ نگاری کا تخلیقی عمل قصہ نگار کے ذہن ومزاج کے ساتھ بدلتا چلا گیا، زمان ومکان کی تبدیلیاں بھی اس پر اثر انداز ہونے لگیں اور قصہ نگاری امکانات وتجربات کے مراحل سے گذرنے لگی، موضوعاتی تنوع کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام رکھے جانے لگے، معاشی وسماجی حالات جس قدر سنجیدہ اور مرکب ہوتے گئے قصہ نگاری کی ہیئت وماہیت میں گہرائی اور گیرائی آتی چلی گئی، لیکن اسے کئی طرح کے تضاد، تصادم اور تذبذب سے دوچار ہونا پڑا، لیکن اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس فن میں قوت نمو بڑھی اور یہ فن ارتقا کے منازل طے کرتا چلا گیا۔ ان سب کے باوجود اس کا قصہ پن باقی رہا، قصہ پن نہ ہو تو تخلیق کو قصہ قرار ہی نہیں دیا جاسکتا۔

تجربے اور ماہیاتی کشمکش سے گزرتی قصہ نگاری نے آگے چل کر داستان کا روپ لے لیا اور انسانی نفسیات کی تسکین اور احساس برتری کو تقویت دینے کیلئے اُن میں مافوق الفطرت اور دیومالائی کرداروں کو وجود بخشا گیا اور محیر العقول کارناموں کے ذکر سے قصہ کو بوجھل بنانے کی کوشش کی گئی۔ ایسے قصوں میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، فسانہ عجائب، وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، ان داستانوں میں فرضی قصے، حسن وعشق اور وصل وہجر کے تذکرے اس انداز میں کئے گئے ہیں کہ قاری تمام کرداروں کی حرکات وسکنات کو اسی پس منظر میں دیکھتا ہے، اور قصہ سے بندھا رہتا ہے، اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے، واقعہ نگاری میں رنگ آمیزی، اسلوب کی چاشنی، کرداروں کی سنجیدگی اور اس کے ساتھ مبالغہ آمیزی اور مضحکہ خیزی کا عجیب وغریب انداز قاری پر جادوئی اثر کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے بیش تر داستانوں کی عبارت میں آمد نہیں آورد اور برجستگی نہیں تصنع کا بول بالا نظر آتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے قصہ نگاری کو داستانی دور سے باہر نکالنے کا بڑا کام کیا انہوں نے قصہ نگاری سے معاشرہ کی اصلاح کا کام لیا، خواجہ الطاف حسین حالی کی "مجالس النساء" نے اس باب میں شہرت پائی، ۱۸۷۴ء میں "مجالس النساء" کی تالیف ہوئی، ڈپٹی نذیر احمد نے مرأۃ العروس ابن الوقت، توبۃ النصوح لکھ کر قصہ نگاری کو کام کی چیز بنا دیا اور شاید پہلی بار اردو میں کسی قصہ نگار نے محض حظ نفس کے بجائے قصہ نگاری کو مکارم اخلاق کے حصول اور گناہوں سے ندامت

اور شرمندگی کے لئے استعمال کیا، ان کتابوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں اچھلتی کودتی اور مچلتی نظر آتی ہیں، اسی وجہ سے ان نقادوں نے جو ادب برائے ادب کے قائل ہیں ان کتابوں پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے:

''نذیر احمد کے ابتدائی دو قصوں میں واقعات کے ربط، تسلسل اور ارتقا کا احساس سرے سے ناپید ہے، ان واقعات کی منطق فنکار کی منطق ہونے کے بجائے واعظ، مصلح اور کہیں کہیں مولوی کی منطق ہے۔''

(داستان سے افسانے تک ص ۶۲)

اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ ان قصوں نے پہلی بار یہ احساس دلایا کہ معاشرہ کے مسائل قصے میں ایسے مؤثر اور دلنشیں انداز میں پیش کئے جاسکتے ہین جن میں ادب کی چاشنی کے ساتھ معاشرتی زندگی کے مسائل کی مصوری اور ایک خاص قسم کی فکر، اصلاحی، مذہبی اور تبلیغی جذبے کے ساتھ لوگوں تک پہنچائی جائے۔ ان قصوں کو پڑھ کر پہلی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ سیدھے سادے اور سچے کردار کے ذریعہ بھی قصہ نگاری کی جاسکتی ہے۔

قصہ نگاری کا جو فن ان دونوں کے یہاں ملتا ہے اس میں کمی اور خامیاں چاہے جتنی نکالی جائیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ قصے ہی اردو ناولوں کے لئے اساس اور بنیاد بنے۔ اور چونکہ فن ترقی پذیر ہوتا ہے، اس میں نامیت ہوتی ہے اس لئے یہ قصے ناول بن کر ہمارے سامنے آئے۔ بعد کے دنوں میں صادق سردھنوی نسیم حجازی وغیرہ نے اپنے ناولوں میں اسلامی تاریخ کو قصہ نگاری میں زیب داستان کے لئے بڑھا چڑھا کر استعمال کیا، اور تاریخی ناول نگاری میں نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا، سماجی اور معاشرتی مسائل کو اٹھانے میں خدیجہ مستور، صالحہ عابد حسین کی قصہ نگاری نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے، ایم اسلم، قیس رام پوری اور رئیس جعفری کا بھی قصہ نگاری میں اہم مقام رہا ہے۔ راشد الخیری، محمد علی طیب کے قصے بھی ہمارے ادبی سرمایہ میں اضافہ ہیں اور بڑی حد تک ادب اسلامی سے قریب تر ہیں۔

صنعتی انقلاب اور معاشرتی تگ ودو نے انسانوں کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ اب اس کے پاس طلسم ہوش ربا، داستان الف لیلہ، فسانۂ آزاد اور ضخیم ناولوں کے پڑھنے کا وقت گھٹتا جارہا ہے، وہ مسلسل بھاگ رہا ہے، اس کے پاس بیوی بچوں کو دینے کے لئے بھی وقت نہیں ہے، ایسے میں مختصر قصہ نگاری نے عروج پایا، جسے ہم افسانے کے نام سے جانتے ہیں۔ پریم چند نے اسے زمینی حقائق سے جوڑا اور موضوعاتی اعتبار سے اسے انسانوں کے کام کا بنادیا۔ یہ روایت آگے بڑھتی چلی گئی، پھر جدیدیت کا دور آیا اور علامتی قصے لکھے جانے لگے ایمائیت اور رمزیت کی وجہ سے قاری اور قصہ کا رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا، ترقی پسندوں نے اسے معاشی مسائل سے جوڑا جس کی وجہ سے دوسرے بہت سارے مسائل پس پشت چلے گئے، اور اب ہم مابعد جدیدیت کے جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں قصہ بڑی تیزی سے اپنی پرانی روش پر آتا چلا جارہا ہے۔ اور یہ فن ارتقاء کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں اس میں قصہ پن بھی ہے اور ادبی رکھ رکھاؤ بھی۔ ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے افسانوں میں صالح اسلامی قدروں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

بہار میں مختصر قصہ نگاری کا فن ہر دور میں عروج پر رہا ہے، ہم فہرست سازی کر کے اسے طول دینا نہیں چاہتے، عصر حاضر میں شفیع مشہدی، شوکت حیات اور عبید قمر کا خاص طور پر نام لینا

چاہوں گا، یہ حضرات اسلامی ادب کا پروپیگنڈہ نہیں کرتے، خاموشی کے ساتھ ان موضوعات پر قصہ لکھتے ہیں جو اسلامی اقدار اور مکارم اخلاق کے مطابق ہیں۔

ہمارے بعض قصہ نگاروں نے مختصر ترین قصہ نگاری کے فن کو رواج دیا جن میں قصہ کے اجزاء ترکیبی تو پورے طور پر پائے جاتے ہیں لیکن وہ قصہ سے زیادہ لطیفہ معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے:

"دو گدھ نے ایک مردار کو دیکھا، ایک نے دوسرے سے کہا چلو! اپنے دوستوں کو بلا کر لاتے ہیں سب مل بانٹ کر کھائیں گے۔ دوسرے نے کہا مت بلاؤ! ہم دونوں دیر تک اس سے فائدہ اٹھائیں گے، پہلے گدھ نے کہا لگتا ہے یار تو بھی انسان ہوگیا۔" ۔

اس میں قصہ پن بھی ہے، مکالمہ بھی ہے اور کلائمکس بھی صرف اس کے اختصار نے اسے لطیفہ بنادیا ہے۔ قصہ کا یہ رنگ وروپ تیزی سے فروغ پارہا ہے اور افسانچے کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔

تحریک ادب اسلامی نے قصوں کو مقصدیت کے اعتبار سے نئی جہت اور نئی بلندیوں سے روشناس کرایا، مائل خیرآبادی، طالبؔ ہاشمی، ابن فریدؔ وغیرہ کے قصے ہمارے ادب کا بیش قیمت اثاثہ ہیں، جن کے ذریعہ سماج میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کو فروغ ملا اور ادب اسلامی کی اہمیت کو لوگوں نے سمجھا۔ عامر عثمانی نے مزاحیہ قصہ نگاری کو عروج بخشا، "مسجد سے میخانہ تک" کے طویل سلسلے میں طنز ومزاح کی چاشنی کے ساتھ قصہ کا فن پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری مطالعہ شروع کرنے کے بعد اسے ختم کئے بغیر نہیں رکھ سکتا۔

قصہ نگاری کا ایک بڑا حصہ نظموں اور مثنویوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اس سلسلہ میں اسماعیل میرٹھی کی نظموں کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے جن میں قصہ اور حکایات کی شکل میں اخلاق حسنہ کی تبلیغ کی گئی ہے۔ یہاں میں شاہنامہ اسلام کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا، جس میں اسلامی تاریخ اور دقائع کو نظم کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی قصوں سے ترجمہ کا کام بھی اردو ادب میں نمایاں رہا ہے، قرآنی قصوں پر بھی اردو میں بڑا کام ہوا ہے، اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی قصص القرآن کو ممتاز مقام حاصل ہے، اخلاق محسنی، اخلاق جلالی، کلیلہ ودمنہ، گلستاں وبوستاں کے قصے اردو ونثر ونظم میں کثرت سے منقول ہیں اور مستقل کتابیں ان پر وجود میں آچکی ہیں، یہ کتابیں مقاصد کی ترسیل میں معاون ہونے کی حیثیت سے بہت اہم ہیں اور کردار سازی کے لئے انتہائی مفید بھی۔

مختصر یہ کہ اردو میں قصہ نگاری کا فن مختلف مراحل سے گذر کر ارتقا کی آخری منزل پر ہے، ضرورت ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ان قصوں کو عوامی اور قاری سے قریب کرنے کی کوشش کی جائے، واقعہ یہ ہے کہ اردو قصوں کا قاری دن بدن الکٹرانک میڈیا کی وسعتوں میں کھوتا چلا جارہا ہے، ہمیں پھر سے اس کی تلاش اور اس فن سے عوام وخواص کو جوڑنے کی کوشش کرنی چاہئے، ایک معاملہ قصوں کے موضوعات کا ہے، گلوبلائزیشن کے اس دور میں ساری دنیا کے مسائل ومشکلات مصائب وپریشانیاں، واقعات وحالات، حوادثات ومعاملات ہمارے اپنے ہوگئے ہیں اور ہمارا قاری اس تلاش میں ہے کہ آج کا قصہ نگار کس طرح ان وسعتوں کو اپنے قصے میں سمیٹتا ہے اور یہ کام آسان نہیں ہے۔ ☆☆☆

اسلامی ادب میں قصہ نگاری کی روایت

ڈاکٹر شکیل اختر لیکچرر شعبۂ عربی، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی

قصے اور کہانیاں لکھنا ادب کے گراں قدر فنون میں سے ایک فن ہے۔ اس کے ذریعہ فکر کو کھیل کود اور تفریحی باتوں میں مشغول کر کے نفس کی کدورت دور کی جاتی ہے اور اُسے سکون و آرام پہنچایا جاتا ہے۔ نیز پُر حکمت باتوں سے عقل و فکر کی اصلاح اور تربیت کی جاتی ہے۔ گذشتہ قوموں کی ادبی تاریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ جب سے انہوں نے اجتماعی زندگی گزارنی شروع کی اُس وقت سے قصے کہانیان اُن کی زندگی کا لازمی حصہ بن گئیں۔ چنانچہ ہندوستانی، ایرانی یونانی اور رومی سبھی قوموں کی ادبیات میں شہرہ آفاق کہانیاں ملتی ہیں۔ اُن میں بعض کہانیاں اِتنی مقبول ہوئیں کہ اُن کو ادب میں صرف قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگئی جواب تک برقرار ہے۔ اُن قوموں میں سے جو قوم ذہنی اور تخیلی اعتبار سے جتنی بلند تھی اُسی تناسب سے اُن کے قصے اور کہانیاں بلند، پُر اثر، دلچسپ اور فنی اعتبار سے معیاری ہیں۔

عرب اقوام کا شمار بھی دنیا کے قدیم قوموں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے زندگی کے مختلف نشیب و فراز دیکھے ہیں اور اُن سے حاصل شدہ تجربات کو کبھی شعر میں اور کبھی نثر میں بیان کیا ہے۔ نثر میں بیان کردہ اصناف میں ایک صنف قصہ نگاری بھی ہے جو عربوں کے یہاں بہت عام تھی۔ ابتدائے اسلام میں لوگ دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر رات میں گپ شپ کے حلقے یا مجلسیں منعقد کرتے تھے۔ جن میں لوگ اپنے اسلاف کے کارناموں، اُن کی بہادری اور شجاعت کے قصوں کو بیان کرتے تھے۔ جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے اقوال و افعال سے اِس کی تائید ہوتی ہے۔

"قيل لبعض أصحاب رسول الله ﷺ ماكنتم تتحدثون به إذاخلوتم في مجالسكم؟ قالوا كنا نتناشد الشعر ونتحدث بأخبار جاهليتنا." (الحديث)

یعنی رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ کرام سے پوچھا گیا کہ جب آپ اپنی بیٹھکوں میں جمع ہوتے تھے تو کیا باتیں کرتے تھے؟ تو صحابہ کرامؓ نے جواب دیا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو اشعار سنایا کرتے تھے اور اسلام سے قبل گذشتہ قوموں کے قصوں، انبیاء و رسل کی کہانیوں اور اسلاف کے

واقعات کو بیان کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کی زندگی کا بیشتر حصہ رات کو گذشتہ قوموں کے قصے اور کہانیاں سننے اور سنانے میں گزرتا تھا۔ اسی طرح قصے کہانیاں سننے سنانے کا رواج اسلامی عہد میں بھی ایک زمانہ تک رہا۔ خود قرآن مجید نے بھی عبرت و نصیحت کیلئے گذشتہ قوموں کے قصوں اور اُن کے عروج و زوال کے واقعات کو مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے اسلاف جو بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے، اونٹوں کی گلّہ بانی کرتے تھے، معمولی کاروبار کرتے تھے، ان کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی نہ کوئی تمدن، نہ کوئی مکتب نہ کوئی مدرسہ اور نہ کوئی خانقاہ، نہ اخلاق و کردار، نہ مُعاشرَت و مُعاملات، نہ کوئی حکومت اور نہ کوئی قانونی نظام، بلکہ ہر قبیلہ خود مختار اور خود پرست تھا۔ ہر طرف جہالت و ضلالت کی گھٹاٹوپ آندھیاں چل رہی تھیں۔ کفر و شرک کے ساتھ ساتھ اخلاقی و معاشرتی بگاڑ اپنے عروج پر تھا۔ ہر طرف قتل و غارت گری عام تھی۔ مگر صرف اسی قرآنی واقعات، انبیاء و رسل کے قصوں اور اسلاف کی کہانیوں سے استفادہ کر کے دنیا کے حکمراں اور انسانیت کے رہنما بن گئے۔ اسلام نے قرآنی قصوں کے ذریعہ اس فن سے انسانیت کو سربلندی عطا کی اور عبرت و موعظت کے لئے نئے آفاق پیدا کئے۔

اسی پس منظر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ پیش خدمت ہے۔ جو قرآن مجید کے سورہ کہف پارہ ۱۵۔ ۱۶ میں مذکور ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا! ''اے کلیم اللہ! کیا اِس دنیا میں آپ سے زیادہ علم و حکمت رکھنے والا بھی کوئی ہے؟''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ''کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے ید بیضاء اور عصائے خاص عطا نہیں کیا! کیا میں نے فرعون جیسی بڑی طاقت کو ختم نہیں کیا! کیا میں نے ایک ہی ضرب سے ۱۲ چشمے جاری نہیں کئے! کیا مجھے اللہ تعالیٰ سے بالمشافہ گفتگو کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ اُس مقام سے بھی بلند کوئی مقام ہوگا؟''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رب قادر و قدیر کی عنایتوں کے اِس فخریہ اظہار پر اللہ تعالیٰ نے اُن پر وحی نازل کی کہ ''اے موسیٰ! یاد رکھو کہ علم ایک بحرِ بے کنار ہے، علم و حکمت اور آگہی کا کوئی اِحاطہ نہیں کر سکتا۔ اِس روئے زمین پر ایک ایسا انسان بھی ہے جسے میں نے تجھ سے زیادہ علم و حکمت اور الہام سے نوازا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب رحمٰن و رحیم سے عرض کیا: ''یا پروردگار! علم و عرفان کا وہ سرچشمہ کہاں ہے؟ میں اُس سے ملنا چاہتا ہو۔ تا کہ علم و الہام کے نور سے اپنے دل کو اور زیادہ مُنور کر سکوں۔'' رب کائنات نے فرمایا کہ: ''اے موسیٰ! ایک خاص سمت میں اپنا سفر جاری رکھو۔ وہ شخص تمہیں مل جائے گا۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خدا کی تعمیل کرتے ہوئے سفر جاری رکھا۔ آخر ایک منزل پر پہنچے تو اُن کو ایک ایسا شخص نظر آیا جس کی پیشانی سے نبوت کا نور جھلک رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُسے سلام کیا تو اُس نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا ''تم کون؟'' انہوں نے جواب دیا ''میں موسیٰ ہوں، میں آپ کی تلاش میں طویل مسافت طے کر کے یہاں پہنچا ہوں۔

تاکہ آپ کے علم وحکمت سے اکتساب کرسکوں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے ساتھ چلوں اور علم وحکمت کے موتیوں سے اپنی جھولی بھرلوں۔''

اُس مردِ معرفت وحکمت کا نام حضرت خضر علیہ السلام بتایا جاتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''آپ میرے ساتھ رہ کر صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتے۔ آپ میری صحبت میں عجیب وغریب واقعات دیکھیں گے جو بظاہر حق کے خلاف نظر آئیں گے مگر بباطن حق وانصاف پر مبنی ہوں گے جن پر آپ خاموش نہیں رہ سکیں گے اور اعترض کریں گے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اِس وعدے اور عہد پر حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساتھ لیا اور دونوں ساحلِ دریا کی طرف چل پڑے یہاں تک کہ انہیں دریا میں ایک کشتی نظر آئی۔ انہوں نے کشتی والوں سے کہا: ''ہمیں دریا سے پار لے چلیں۔'' کشتی بانوں نے دو انتہائی نیک صورت بزرگوں کو دیکھا تو ازحد تعظیم وتکریم سے پیش آئے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کو کشتی میں سوار کرلیا اور دریا کے دوسرے کنارے کی طرف چل پڑے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں بیٹھے ہوئے چپکے سے کشتی کی دو تختیاں اکھیڑیں اور کشتی کے پیندوں میں سوراخ کردیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بے اختیار بول اٹھے: ''آپ ایسے لوگوں سے زیادتی کررہے ہیں جنہیں میں قدرومنزلت کا مستحق سمجھتا ہوں کیونکہ انہوں نے ہمارے ساتھ بھلائی کی ہے، ہماری عزت افزائی کی ہے اور بغیر معاوضے کے ہمیں دریا پار کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ کیا آپ اپنے محسنوں کی کشتی کے پیندوں میں سوراخ کرکے انہیں ڈبونا چاہتے ہیں؟ یقیناً یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن کا وعدہ یاد دلایا اور کہا: ''کیا میں نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری رفاقت میں رہ کر آپ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتے۔''

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا وعدہ یاد کرکے حضرت خضر علیہ السلام سے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ اب آئندہ میں صبر سے کام لوں گا۔''

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کشتی سے اترے اور ایک طرف چل دیے۔ راستے میں انہوں نے چند بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اُس جگہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک چھوٹے سے خوبصورت بچے کو پکڑا، اُسے دور لے گئے اور وہاں جاکر اُسے قتل کردیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ منظر دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے ''اتنا بڑا ظلم! ایک معصوم بچے کا قتل!۔ ہوسکتا ہے کہ وہ والدین کا واحد سہارا ہو۔ اُسے آپ نے ناحق قتل کرڈالا۔ بلاشبہ آپ نے ایسا کام کیا ہے جو بہت ہی نازیبا ہے۔''

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن کا وعدہ پھر یاد دلاتے ہوئے صرف اتنا کہا: ''اے موسیٰ علیہ السلام! کیا میں نے آپ کو یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ میری رفاقت میں صبر نہیں کرسکیں گے۔ میں نے تو شروع میں ہی یہ

اندازہ لگالیا تھا کہ آپ ظاہری واقعات پر خاموش نہیں رہ سکیں گے اور اعتراض کریں گے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا وعدہ پھر سے یاد آیا اور وہ بہت شرمندہ ہوئے اور جان گئے کہ میرا اعتراض کرنا حضرت خضر علیہ السلام کو کتنا گراں گزرا ہے۔

انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "اگر اب میں آپ سے کسی فعل کے بارے میں اعتراض کروں تو بے شک آپ مجھے اپنے ساتھ مت رکھئے گا۔ کیونکہ اِس سے آپ کی دل آزاری ہوتی ہے اور میری طرف سے وعدہ خلافی۔"

چنانچہ اِس شرط پر سفر پھر سے جاری ہوا۔ راستے میں ایک بستی آئی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام دونوں سفر کی تھکان سے چور چور تھے اور دونوں بھوک کی شدت بھی محسوس کررہے تھے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام دونوں بستی میں داخل ہوئے اور بستی والوں سے آرام کرنے کے لئے جگہ اور بھوک مٹانے کیلئے کھانے کا مطالبہ کیا۔ مگر بستی والوں نے صاف انکار کردیا۔ دونوں بھوکے، پیاسے، تھکے ماندے بستی سے نکل کھڑے ہوئے، بستی کے آخری سرے پر انہوں نے دیکھا کہ ایک بوسیدہ دیوار جو گرنے کے قریب تھی حضرت خضر علیہ السلام وہاں رک گئے اور دیوار کی مرمت کرڈالی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر جوش میں آگئے اور حضرت خضر علیہ السلام سے کہنے لگے: "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ ایک ایسی بستی کی دیوار مرمت کردی جہاں کے باشندے ہم سے سیدھے منہ بات تک کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری لے لیتے تاکہ ہم لوگ اپنی بھوک تو ضرور مٹالیتے۔"

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اِس اعتراض پر انہیں اُن کا وعدہ اور شرط دونوں یاددلاتے ہوئے کہا: "اب آپ کی اور میری رفاقت ختم! اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آگیا ہے اور "ھذا فراق بینی وبینك" کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کہا کہ اِس سے پہلے کہ میں آپ سے جدا ہوں میں آپ کو اُن تمام واقعات کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ جن پر آپ صبر نہ کرسکے۔

دراصل وہ کشتی چند غریب محنت کش لوگوں کی ملکیت تھی اور اُن کی روزی کا واحد سہارا تھی۔ لیکن ظالم بادشاہ ہر صحیح سالم کشتی کو لوگوں سے زبردستی چھین رہا تھا۔ میں نے اُس کشتی کے پیندوں میں سوراخ کردیا تاکہ ظالم بادشاہ اُسے غصب نہ کرسکے۔ اگرچہ یہ کام بظاہر ظلم تھا مگر بباطن غریبوں کی بقاء کیلئے ضروری تھا۔"

اور یاد رکھو! دوسرا جس بچے کو میں نے قتل کرڈالا وہ بچہ بڑا ہوکر بہت بے شرم اور ناپسندیدہ خصلت کا ہوتا۔ اُس کے والدین ایماندار اور تقویٰ والے تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ بچہ والدین کو بے جا ہمدردی اور گناہ پر مجبور نہ کردے اور اُن کا خاتمہ ایمان وتقویٰ کی بجائے سرکشی اور کفر پر نہ ہوجائے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ رحیم وکریم اُنہیں اس سے زیادہ خوبصورت اور سعادت مند بچہ عطا فرمائے گا۔

اور تیسرا جہاں تک اُس دیوار کی مرمت کا تعلق ہے تو اُس دیوار کے نیچے بستی کے دو بچوں کا خزانہ دفن ہے۔ اُن

معصوموں کے والد نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں نے اُس دیوار کو درست کر دیا۔ تا کہ یہ خزانہ محفوظ رہے اور وہ یتیم بچے جب بڑے ہوں تو اُسے نکال لیں اور حلال و پاکیزہ مال وراثت میں حاصل کریں۔ اور ہاں! ایک بات یاد رکھو کہ یہ سب کچھ میں نے اپنے علم اور اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ اُن امور سے متعلق میری طرف خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے وحی نازل کی گئی اور رہنمائی ہوئی تو میں نے یہ تمام کام سرانجام دیئے۔ مگر آپ نے صرف ظاہر کو دیکھا اور اعتراض کرتے گئے۔ یہی بات شروع میں ہی آپ کے گوش گزار کر دی تھی کہ آپ صبر نہیں کر سکیں گے۔ بہر حال حسب وعدہ اب ہم جدا ہوتے ہیں۔ اللہ حافظ۔"

(سورہ کہف، پارہ: ۱۵۔۱۶)

ان تمام واقعات کو شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے ایک شعر میں یوں سمیٹ دیا ہے:

کشتیِ مسکین وجانِ پاک ودیوارِ یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اسلامی ادب کے اس تاریخی واقعہ کا ماحصل یہ ہے کہ علم ایک بحرِ بے کنار ہے اور مکمل علم کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا ہے جیسا کہ اللہ رب ذوالجلال کا ارشاد ہے:

"وما أوتيتم من العلم إلا قليلا۔" اور یہ سچ ہے کہ رب غفور ورحیم کی باتیں اُسی کو معلوم ہیں۔ ہم رب کائنات کی پوشیدہ باتوں اور پراسرار کاموں کا بھید سمجھنے سے یکسر قاصر ہیں۔ جب ایسا ہی ہے کہ تو پھر ہم رب ذوالجلال کے کاموں پر کیوں معترض ہوتے ہیں؟ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ رب رحمٰن ورحیم کے ہر کام میں اُس کے بندوں کیلئے کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور چھپی ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم:

"وعسىٰ أن تكرهو اشيئاً وهو خيرلكم وعسىٰ أن تُحبو اشيئاًوهو شرلكم۔ والله يعلم وأنتم لاتعلمون۔" کے عملی تفسیر بنیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں یہی درس موجود ہے۔

خلاصہ کلام: اسلامی ادب میں قصہ نگاری کی روایت کے موضوع کے تناظر میں اہل عرب کے یہاں قصہ نگاری کی طویل اور قدیم روایت کا سرا علمی انداز میں اسلامی ادبیات تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ادبیات میں قصے اور کہانیوں کا ایک وقیع سرمایہ موجود ہے۔ جو داستان، ناول، افسانہ اور مقامات کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اسلامی ادب میں قصہ نگاری کی وسعت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مصر کے مشہور ومعروف ناول نگار محمد حسین ہیکل جنھوں نے اسلامی ادب میں حضرت محمد ﷺ، خلفائے راشدین اور صحابہؓ پر متعدد مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کتابوں میں اسلام کی بنیادی معلومات اور اہم خصوصیات پر مؤرخانہ بصیرت اور پُر اثر انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اُن کی سب سے مقبول مذہبی کتاب "أبوبكر صديقؓ" پر اُن کو بین الاقوامی (International) ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ ☆☆☆

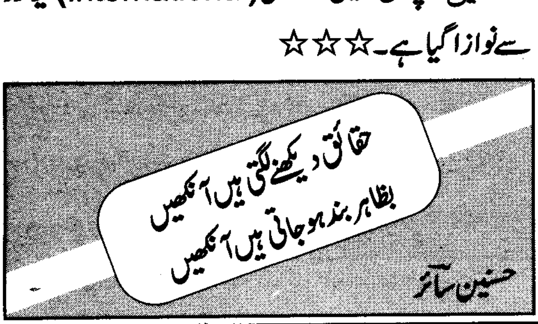

اردو زبان میں قصہ نگاری کی روایت

ڈاکٹر ارمان نجمی

قصہ نگاری ہر علاقہ، ہر ملک، ہر زبان کی تہذیب وثقافت، تمدن ومعاشرہ اور فکری رجحانات کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے اور اپنے ماضی کے رشتوں کا احساس بھی دلاتی رہتی ہے۔ قصہ نگاری سے انسان کے ذہنی ارتقاء اور انسانی، انفرادی، اجتماعی ماحولیاتی رشتوں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تاریخ اور جغرافیہ کا پتا بھی ملتا ہے۔ قصہ خوانی کا بازار صرف اسی لئے ساری دنیا میں مشہور ومعروف ہے کہ وہاں قصہ کہنے والے کے گرد سننے والے گھیرا ڈالے رہتے تھے۔ کسی لفظ خاص کر جب وہ ایک اصطلاح کی صورت اختیار کرلے تو اس کی ایک جامع مانع اور مکمل تعریف آسان کام نہیں۔

لیکن قصہ سے مراد کسی شخص یا جماعت کے ساتھ پیش آنے والا کوئی واقعہ یا سرگزشت جو انفرادی اجتماعی یادداشت کا حصہ بن جائے لیکن اس کے ساتھ کوئی سبق آموزی، نصیحت یا اخلاقی پہلو بھی وابستہ ہو۔ یہ قصے عام مردوزن سے لے کر امرا اور حکمرانوں تک محیط ہوسکتے ہیں۔ اور ان واقعات سے منسلک کردار انسان، حیوان، پرندے، چرندے، درندے سمیت سبھی جاندار کے علاوہ فطرت کے مظاہر جیسے پہاڑ، ندی، بادل، بارش، جنگل، درخت، زمین، آسمان سبھی شامل ہوسکتے ہیں۔

قصہ کا لفظ صرف اسی معنی میں استعمال نہیں ہوتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

ما قصۂ سکندر ِ دارا نہ خواندہ ایم
از ما بہ جز حکایت ِ مہر ووفا مپرس

یہاں قصہ سے مقصود ہے تواریخ جسے اب تاریخ کہا جارہا ہے۔ جو کل تک صرف تقدیم کے ماہ وسال کے ایک دن تک محدود تھا۔ یہاں حکایت کا لفظ بھی اسی معنی میں آیا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قصہ اور حکایت دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں لیکن یہاں ایک فارسی شعر میں استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور مصرع دیکھئے:

''یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا''

یہاں قصہ اسی مستعمل معنی میں آیا ہے۔ ایک اور محاورہ دیکھئے:

''مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد وخر رفت''

یہاں قصہ کے معنی بھی اسی واقعاتی تناظر کی جانب اشارہ کناں ہے:

ہر زبان کی طرح اردو میں بھی قصوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جو عوامی حافظے اور اجتماعی لاشعور میں محفوظ

ہے۔ بہت سے قصے ایسے ہیں جو پہلے زبانی شکل میں سامنے آئے بعد میں ان کو تحریری شکل دی گئی۔ قصے مختلف جہتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جیسے دیوؤں اور پریوں کے قصے، عشق ومحبت کے قصے، شہزادہ سلیم وانارکلی، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سونی مہیوال اورنل ودمن وغیرہ۔

مذہبی صحیفوں کے قصے جیسے قرآن مجید میں پیغمبروں کے متعلق بیانات۔ قصص الانبیاء میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت مریمؑ وحضرت عیسیٰؑ، حضرت یونسؑ اور حضورؐ کی سوانح حیات آمنہ کا لعل سے لے کر آپ کے متعلق کے مختلف واقعات اور آپ کے ارشادات درج ہیں۔

اپنے ملک ہندستان جنت نشان میں قصوں کی روایت بہت پرانی ہے اور گوتم بدھ اور بودھ مذہب کے جاتک قصے، وید پرانوں، رامائن اور مہابھارت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ رامائن کا قصہ مشرق بعید کے ملکوں جیسے لاؤس، کمبوڈیا، انڈونیشیا کے علاقوں، جاوا، ساترا اور بالی کے عوام میں آج بھی مقبول ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ زبانی ادب (Orature) کی شکل میں تحریری ادب (Scripture) کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ایک ہی شخص رام کو ایک قصہ میں شہزادہ لکھا گیا ہے تو دوسرے میں کچھ اور۔ حد تو یہ ہے کہ والمیکی کی سنسکرت رامائن میں کچھ حصے ایسے ہیں جو اودھی زبان میں لکھی گئی تلسی داس کی رامائن سے مختلف ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔

بچپن میں میں نے جو قصے پڑھے ہیں ان میں الف لیلہ کی اور اس کی شہزادی اور اس کی بہن دنیازاد کی کچھ حکایتیں، علی بابا اور چالیس چور، ابھی تک یاد ہیں اور منتخب الحکایات شیر اور چوہا، خرگوش اور کچھوا، پیاسے کوئے اور گھڑے اور بھوکے شیر اور لومڑی کے قصے بھلائے نہیں بھولتے۔ یہ بات کچھ دنوں پہلے معلوم ہو سکی کہ منتخب الحکایات دراصل ''یوسپ کے فبلس'' کا اردو ترجمہ ہے جو ڈپٹی نذیر احمد نے کیا تھا۔

قصہ نگاری اور قصہ خوانی کی یہ روایت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ جب زبان سے ہمارا لگاؤ ختم ہوتا جا رہا ہے تو قصہ کون سنے اور کن سنائے؟ اب گھروں میں نہ نانیاں ہیں نہ دادیاں۔ اماں جان بھی اگر برسرِ روزگار ہیں تو بچوں کی ذہنی نشو ونما پر اتنی کاوش ہو ہی نہیں سکتی۔ تو پھر رات کو سونے سے پہلے قصہ سننے سنانے کا موقع کہاں۔ پھر ہم خود اپنی روایتوں سے روگردانی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

اب ٹی وی پر بچے کارٹون دیکھنا پسند کرتے ہیں پنک پنتھر (Pink Panther) اور ٹوم اینڈ جری سے اُن کا رشتہ مضبوط ہو رہا ہے کہ اسے دلچسپ پیرایہ میں رنگین تصویروں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے اور ہم تو ابھی تک تصویروں کو حرام و حلال کے پیمانے میں رکھ کر تولتے ہیں۔ کیا بلی چوہے یا شیر، کتے کا کوئی متبادل رنگین قصہ فلمی کارٹونوں کے ذریعے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یا خوجی فولادی کے کردار پر مبنی کارٹون تیار نہیں ہو سکتے؟

ہماری نئی نسلوں کے ذہن سازی اپنی مادری زبان کے ذریعے نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ انگریزی یا دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی زبانوں کے ذریعے عمل میں آ رہی ہے۔

بقیہ صفحہ ۴۵ پر

اسلامی ادب میں قصہ نگاری کی روایت

مولانا محمد بدرالدین فریدی
خدابخش لائبریری، پٹنہ

ہر ابتداء کا بتدریج ارتقاء بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ادب میں قصہ نگاری کی روایت کا ارتقاء ہبوط آدم سے شروع ہوتا ہے اور اس روئے زمین پر نئے قصے کی پیدائش ہوتی ہے۔قصوں کے اسلوب میں تبدیلی آتی ہے۔آدم کے بیٹوں قابیل اور ہابیل کا قصہ وجود میں آتا ہے۔جس میں ایک جانور کا کردار در آتا ہے۔جس سے قصے کے کرداروں میں تنوع پیدا ہوتا ہے ساتھ ہی ہیئت میں یہ تبدیلی آتی ہے کہ رزمیہ اور عشقیہ قصوں کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

ہوا یوں کہ آدمؑ کے بڑے بیٹے قابیل نے اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔مگر چونکہ یہ دنیا میں پہلی موت تھی اس وجہ سے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔جب چھپانا مشکل ہو گیا تو اس وقت خدا نے دو کوے بھیج کر تجہیز و تکفین کے طریقے رائج کروائے۔ بتایا جاتا ہے کہ قابیل نے اپنی بہن اقلیچا کے حسد میں ہابیل کو مار ڈالا تھا۔چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ع

عشق میں اکثر بنی آدم نے کیں خوں ریزیاں
مار ڈالا کس طرح قابیل نے ہابیل کو

پھر ہزاروں کروڑوں سال بعد ایک جماعت نے قابیل اور ہابیل میں جنگ کا اصلی سبب یہ معلوم کر لیا کہ آدمؑ اپنے بڑے بیٹے قابیل کی جگہ ہابیل کو اسم اعظم سکھا کر اپنا وصی بنانا چاہتے تھے۔

بہر حال انسانی ارتقاء کے ساتھ قصے ارتقائی منازل طے کرتے رہے اور قصوں کی روایت آگے بڑھتی جا رہی۔اب نوحؑ کا زمانہ آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت تک انسان ایک حد تک متمدن ہو چکا تھا۔حرفت و ترکیب سیکھ چکا تھا اور اتنا زیادہ مہذب (Civilised) ہو چکا تھا کہ نوحؑ کی ہزار سالہ تبلیغ کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی تکمیل کا وقت آ گیا اور پھر ایک طویل قصے کا جنم ہوا جسے طوفان نوحؑ کا قصہ کہا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا قصوں میں کردار جاندار تھے۔اب ایک بے جان کردار کشتی کا قصے میں اضافہ ہوا۔اور ہیئت میں یہ تبدیلی آئی کہ افراد سے بڑھ کر قصوں میں اقوام کی شمولیت ہوگئی۔اس طرح طوفان نوحؑ کا قصہ قوم نوحؑ کا قصہ بن گیا۔ہوا یوں کہ نوحؑ نے اپنی قوم کو ہزار سال تک سمجھایا بجھایا مگر اس نے بجائے سمجھنے بوجھنے کے سرکشی اور لاابالی پن کو ہی اپنا شعار بنایا۔چنانچہ نوحؑ نے اللہ سے کہا کہ ان سرکشوں اور منکرین میں سے کوئی بھی اس روئے زمین پر باقی نہ رہنے پائے۔اللہ نے ایسا ہی کیا اور نوحؑ کو کشتی بنانے اور اس کے اندر سبھی جانداروں اور سمجھداروں کو ساتھ لے کر اس طوفان سے بچنے کی ترکیب بتائی۔ یہی وہ وقت ہے جب محاذی (Parallel) قصوں کی ابتداء کا سراغ ملتا ہے۔جیسا کہ معلوم ہے نوحؑ کے وقت سے ہی عوج بن عنق کا قصہ چلا آتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ طوفان نوحؑ میں ساری دنیا ڈوب گئی

مگر عوج بن عنق کے گھٹنوں تک ہی پانی پہنچا تھا۔

اس کے بعد سے قصوں کے ارتقائی سفر کی ایک لمبی کڑی ہے۔ جس میں ہودؑ، صالحؑ، قوم عاد وثمود، ابراہیمؑ ونمرود کے قصے، اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ اور اسحٰقؑ کے قصوں میں قصوں میں قصہ گوئی کی فنی باریکیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی دور میں یا اس کے متصل دور میں حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے لوطؑ کا قصہ رونما ہوتا ہے۔ اس کے بعد یعقوبؑ اور یوسفؑ کے قصوں سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جسے عشقیہ قصوں کی انتہا کا وقت کہا جاتا ہے جس میں ایک طرف یعقوبؑ بیٹے کی محبت میں روتے روتے بینائی کھودیتے ہیں تو دوسری طرف عزیز مصر کی بیوی جسے عرف عام میں زلیخا کہا جاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے عشق میں حد سے گذر جاتی ہے۔ اسی دور سے مزاحیہ قصوں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے دھاگہ بنانے والی ایک مٹھی روئی لے کر ایک بڑھیا حضرت یوسفؑ کو خریدنے پہنچ جاتی ہے۔ اس قصے کا یہ کردار بھی بڑا دلچسپ ہے۔ طوالت سے گریز کے سبب تفصیل کو چھوڑ رہا ہوں۔ اشارے ہی کافی ہیں۔ اس کے بعد حضرت شعیبؑ، مدین اور اصحاب ایکہ کے قصے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ، ان کے بھائی ہارونؑ، فرعون، قارون اور خضرؑ کے قصوں کو فنی اعتبار سے بہت وسیع قصے کہے جاسکتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ، طالوت اور جالوت، اس کے بعد سلیمان اور ملکہ سبا کے قصوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ حضرت ایوبؑ، یونسؑ، اور ذوالکفل کے قصے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

حضرت زکریاؑ، ویحیٰؑ کے قصے قدرے جدید دور کے قصے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت لقمانؑ اور تعمیر بیت المقدس کے قصوں کو لیا جاتا ہے۔ ذوالقرنین، سدسکندری، یاجوج، ماجوج، ہاروت ماروت، مآرب، ارم، اصحاب اخدود، قوم تبع، اصحاب فیل، کے قصے ہیت وکردار کے لحاظ سے اہم ہیں۔

حضرت مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کے قصوں پر آج تک بحثیں چلی آرہی ہیں۔ یہ تمام قصے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل لوگوں میں خاص طور پر یہود ونصاریٰ میں رائج تھے۔

اب نبی آخرالزماں ﷺ کی بعثت ہوتی ہے اور قرآن مجید کا نازل ہونا شروع ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے نزول کے ابتدائی مرحلے ہی سے عہد عتیق کے منقول قصوں کو محرف اور لغو قرار دے کر خصوصیت کے ساتھ پیغمبران خدا اور خاصان خدا کے سچے قصے سنانا شروع کیا۔ جس سے قصوں میں دلکشی پیدا ہوگئی۔ اور ان تمام قصوں کی حقیقت سامنے آگئی جو اسلام کے قبل کے لوگ خاص طور پر یہود ونصاریٰ نمک مرچ لگا کر پیش کرتے رہتے تھے۔ قرآن نے اپنے ماقبل کے مروج قصوں میں جن کی تصحیح وتفصیل ضروری تھی بڑے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ اور اصحاب کہف وغیرہ کے قصوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ قصوں میں بات سے بات نکالنے کی عام عادت ہوتی ہے چنانچہ یہود ونصاریٰ کے قصے ابتدائے اسلام میں اسی طرح کے تھے۔ اصحاب کہف کے قصے میں ان کی تعداد سے متعلق بڑی لمبی چوڑی کہانی یہودیوں نے گڑھ لئے تھے کہ ان کی تعداد کیا تھی۔ کتنے برسوں غار میں مقیم رہے۔ اس کے متعلق قرآن نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ اس تعداد کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور وہاں آپ اس بارے میں ان سے زیادہ بحث نہ کیجئے اور ان کے

بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے کچھ نہیں پوچھیۓ اور کہہ دیجیۓ کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اصحاب کہف غار میں کتنے دنوں ٹھہرے رہے (کہف ۲۲ تا ۲۶)۔ جن قصوں میں تصرفات اور تحریفات نہیں تھیں ان کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیئے گئے ہیں، مثلاً واتل علیهم نبأ الذی الخ (اعراف ۱۷۵) یعنی اس قوم کا قصہ سنا دیجیۓ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ اس قصے میں مروج روایات کے مطابق حضرت موسیٰ کے وقت کے عابد بلعم باعور کو راجح مان لیا گیا ہے۔ جیسا کہ ابن عباس کی روایت سے مروی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میدان تیہ میں موسیٰ کی سرگردانی بلعم باعور کی بددعاء کی وجہ سے تھی۔ شاعر کہتا ہے ع

دعائے بلعم باعور بھی اللہ نے سن لی
رہے سرگرداں موسیٰ سالہا بطحائے ایمن میں

قرآن نے قصوں کے بیان میں جن لفظوں کو استعمال کیا ہے ان میں چار الفاظ خصوصیت سے گنائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً قصہ کی جمع قصص جس کے لئے قصصا کہا۔ یہاں تک کہ ایک مستقل سورہ قصص کے نام سے نازل ہوئی۔ نبأ کی جمع انبا جس کے لئے نبأ اور انبا دونوں استعمال کئے۔ خبر جس کی جمع اخبار ہے ان دونوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح اسطورہ کی جمع اساطیر کا استعمال ہوا ہے۔ واضح رہے کہ یہی لفظ اسطورہ بعد کے دنوں میں انگریزی کا لفظ History بنا۔ ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ علم تاریخ بھی انہیں قصوں کی دنیا کی زائیدہ ہے۔ جس میں کچھ اصول وضوابط پر کار بند رہ کر واقعات وسوانحات بیان کئے جاتے ہیں۔ بہر حال بات چل رہی تھی قصوں کی تفصیلات کی۔ اس کے متعلق قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بہت سے رسولوں کے قصے بیان کئے گئے اور بہت سے رسولوں کے قصے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ المختصر یہ کہ قصص قرآن ایک وسیع علمی میدان بن گیا۔

خود رسالت مآب ﷺ سے بہت سے قصے منقول ہیں جو احادیث کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ قصص قرآن کی طرح قصص الحدیث بھی علاحدہ مرتب کئے جانے لگے۔ یہاں پر یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ حضور ﷺ کے ایک صحابی حضرت تمیم داری تھے۔ انہوں نے ۹ ھ میں عیسائیت سے توبہ کی اور اسلام کا دامن تھاما۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں انہوں نے ہی سب سے پہلے مسجد نبوی ﷺ میں قصہ گوئی شروع کی۔ ان کی دیکھا دیکھی اسلامی قلمرو میں قصہ گوئی پھیل گئی۔ حضرت تمیم داری آں حضرت ﷺ کو بھی قصے سناتے تھے۔ چنانچہ فاطمہ بنت قیس سے مروی دجال کا قصہ بہت مشہور ہے جس میں دجال نے کہا کہ میں چالیس دن میں سب جگہ پہنچ جاؤں گا مگر مکہ اور مدینہ میں ہماری رسائی نہیں ہو سکے گی کیونکہ وہاں فرشتے ننگی تلواریں لئے محافظت کے لئے کھڑے ہیں۔ میرا داخلہ وہاں ناممکن ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے مدینہ کے یہود ونصاریٰ رسالت مآب ﷺ کے سخت ترین دشمن تھے۔ جسمانی ایذا رسانی کے علاوہ قتل کر دینے تک کا منصوبہ نعوذ باللہ بنا رکھا تھا۔ ساتھ ہی دوسری طرف فکری ایذا رسانی کا سلسلہ قصوں کے ذریعہ جاری کر رکھا تھا۔ جس کے تحت دجال کی ایسی بھیانک کہانی سناتے کہ عام مسلمانوں میں خوف ودہشت پیدا ہو جاتی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا کہ اگر دجال میرے زمانے میں نکلا تو میں

تم کو اس کے شر سے بچاؤں گا۔ آگے چل کر حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں قصہ گوئی کی ان مجلسوں پر روک لگادی۔ بصرہ کی مسجد سے قصہ گو نکلوا دیے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اموی دور میں قصہ گوئی عام ہوگئی۔ مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ فجر کی نماز کے بعد قصہ گوئی شروع کی جاتی تھی، خاتمے پر دعاء کی جاتی تھی۔ اس میں دعائے ماثورہ کے علاوہ خلیفہ وقت کی سلامتی کی دعاء اور دشمنوں کی بربادی وہلاکت کے لئے بددعاء کی جاتی تھی۔ ان تمام قصوں کو کسی حد تک محفوظ بھی کر لیا گیا ہے۔ بعد کو یہی قصے تفاسیر وشروح احادیث میں جگہ بھی پاگئے۔ سب سے زیادہ ان قصوں کو واقدی نے سمیٹا۔ ان ہی کے حوالے سے بعد کے لوگوں نے اپنی اپنی زبان میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام کے قصوں کا زمانہ آیا۔ چنانچہ حکایات الصحابہ کے نام سے اسے جمع کیا جانے لگا۔ تابعین، تبع تابعین ہر دور کے قصے محفوظ ہیں۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی کا قصہ آج بھی ادبی دنیا ہی نہیں خواص وعوام میں بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ حضرت فاطمہ اور رابعہ بصریہ کے قصے بچوں کو سنائے اور سکھائے جاتے ہیں۔ بعد کے زمانے میں اخلاقی قصوں کو بڑی اہمیت دی گئی۔ یہ سلسلہ بہت دراز ہے۔ میں ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ تاہم مثنوی مولانا روم اور شیخ سعدی کی گلستاں وبوستاں کی طرف اشارہ ضروری ہے جن کے قصے دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ ان قصوں کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے قصے بھی جمع ہوتے گئے۔ یہ سلسلہ بھی دراز اور ہنوز جاری ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿بقیہ اردو زبان میں قصہ نگاری...ڈاکٹر ارمان نجمی﴾

اس صورت حال کا ذمہ دار بے شک جمہوریت کا ڈھول بجائے جانے والے آزاد ہندوستان کا نصاب تعلیم ہے۔ آپ پٹنہ کے ۱۰؍ بہترین اسکولوں میں جاکر دیکھ لیجئے وہاں اردو کی تعلیم کا وجود ہی نہیں ہے سی. بی. ایس. ای. نظام تعلیم سارے ہندوستان میں اردو کی خط تقدیر پر سیاہی پھیر چکا ہے۔ اور اب بہار سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کا نیا نصاب جو اسی طرز پر بنایا جارہا ہے۔ اس میں بھی اردو اب ایک اختیاری مضمون کی حیثیت اختیار کرے گا یہ اسکول کی انتظامیہ کی مرضی پر منحصر ہوگا کہ وہ اردو ایک موضوع کی حیثیت سے پڑھوائیں یا نہ پڑھوائیں۔

ہمیں فرصت کہاں کہ اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ ہمارے گھرانوں کے بچے کس طرح اپنی زبان اور اپنے الفاظ سے کٹتے چلے جارہے ہیں۔ آخر ہمیں کس نے روکا ہے کہ اسکول میں نہیں تو نجی طور پر ہی سہی گھر میں اپنے بچوں کو عربی قرآن اردو اور کچھ فارسی کی تعلیم دلاسکیں۔ بہت شرم کی بات ہے کہ جو ابتدائی اسکول ہمارے گھروں میں کھل رہے ہیں یا ہمارے اپنے لوگ کھول رہے ہیں ان میں اردو کا نام ونشان ہی نہیں اردو کے مڈل اسکولوں اور پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کو صرف نام ہے آپ کسی اردو مڈل اسکول کا نتیجہ نامہ (Report Card) دیکھ لیجئے۔ اس میں اردو کا ذکر کہیں نہیں ملے گا۔ بچے دیوناگری میں سوال پڑھتے ہیں اور اسی رسم الخط میں جواب لکھتے ہیں۔ شاید اسی میں وہاں پڑھانے والے اساتذہ کا بھلا ہے۔ یہ سوال مت کیجئے کہ بغیر اردو جانے وہ اردو پڑھانے والے استاد کی ملازمت حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوگئے۔ ☆☆☆

''اردو زبان میں قصہ نگاری کی روایت''

ڈاکٹر محبوب اقبال
شعبۂ اردو بی۔ آر۔ اے بہار یونیورسٹی، مظفرپور

قصہ یا کہانی انسانی جبلت میں داخل ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کہانیوں کا دلدادہ رہا ہے۔ ماہرین عمرانیات کے مطابق انسان اس وقت بھی قصوں میں دلچسپی رکھتا ہوگا جب اس کے پاس ملفوظی آوازیں نہیں تھیں۔ اس وقت بھی اپنی جسمانی اعضاء کی حرکات وسکنات سے دن بھر کی گذری باتوں کو شام میں دوسروں کے سامنے بطور تفنن طبع بیان کرتا ہوگا اور ان اشارات میں پوری پوری کہانیاں پنہاں ہوتی ہوں گی۔ دھیرے دھیرے یہ حرکات اور بے معنی آوازیں بامعنی آوازوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ انسان کچھ اور مہذب ہوا اور مکانات بنا کر رہنے لگا، مختلف پیشے اپنا لئے لیکن فطرت نہیں بدلی وہ دن بھر کی محنت کے بعد چوپال میں جمع ہوتے تو ہر شخص اپنی اپنی کہانیاں سناتا، اپنے مشاہدات بیان کرتا، ساتھ ہی ان کہانیوں میں اپنی بساط بھر رنگ آمیزی کرتا، اس طرح قصوں میں دلچسپی پیدا ہوتی اور دھیرے دھیرے یہ فن بنتا گیا، یعنی قصوں کہانیوں کو بیان کرنے کا فن۔ اس طرح دنیا میں قصہ گوئی کی ابتداء ہوئی ہوگی، ماہرین لسانیات کی مانیں تو زبانوں کو مختلف درجوں میں رکھا گیا ہے۔ خطوں اور خصوصیات کے اعتبار سے تقسیم کر کے زبانوں اور ان کے ادب کو الگ الگ کر دیا گیا۔ لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ تمام زبانوں کے ادب کی بنیاد میں قصہ گوئی ہی ہے اس بات سے قطع نظر کہ ادب پارہ منظوم ہے یا منثور۔ ابتدائی دور کے ادب پاروں کو لیں تو ڈان کو ٹکزوٹ ہو یا موبی ڈکہ، کلیلہ ودمنہ ہو یا پنچ تنتر کی کہانیاں، کنٹربری حکایات ہوں یا پھر جاتک کتھائیں، عیسائی مذہب کے Parables ہوں یا آلڈھم اور ربیڈ کی باتیں، سب کی بنیاد میں قصہ گوئی ہے۔

زبان اردو میں بھی قصہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے چوں کہ ابتدا میں داستانیں کہی اور سنی جاتی تھیں، بعد میں لکھ کر محفوظ رکھنے کی بنیاد پڑی۔ اس لئے قصوں کی قدامت کا اندازہ صرف محفوظ ادب پاروں سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً اردو کی قدیم اور طول طویل داستان ''طلسم ہوش ربا'' اپنے وقت کی مقبول ترین داستان ہے۔ اس کے کردار اور واقعات آج بھی دلچسپی کا باعث ہیں اس کے بعد بے شمار داستانیں لکھی گئیں اور مقبول عام ہوئیں لیکن سب کی بنیاد قصہ گوئی ہے۔ اردو کی چند مشہور داستانیں ہیں۔ طلسم حیرت، توتا کہانی، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی نوطرز مرصع، قصہ مہر افروز و دلبر، عجائب القصص، باغ و بہار، فسانۂ عجائب وغیرہ یہ داستانیں آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔ عربی کی مشہور زمانہ داستان ''الف لیلہ'' دنیا کی ان چند معروف داستانوں میں سے ایک ہے جس کا ترجمہ ان گنت بار اور ان گنت زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس قصہ پر کئی زبانوں میں فلم بھی بنی اور ٹی۔ وی سیریل بھی بنے، ڈرامہ کی شکل میں بھی غالباً پیش کیا جا چکا ہے۔ یقیناً یہ مقبولیت قصہ نگاری کی وجہ سے ہی ہے اور ان کہانیوں کی ندرت کی وجہ سے بھی۔

داستانوں کے بعد اردو ناول کی باری آتی ہے۔ اردو میں ناول نگاری کی ابتدا انیسوں صدی کے نصف آخر میں ہوتی ہے۔ اردو کے تمام ناقدین اس امر پر اتفاق کرتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد ہی اردو کے اولین ناول نگار ہیں اور ان کی تصنیف ''مرأۃ العروس'' اردو کا پہلا ناول ہے۔ اکبری اور اصغری جیسے کرداروں کے ذریعے قصہ گوئی کی روایت کی توسیع ہوتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کے علاوہ دوسرے ناول نویسوں نے بھی اس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سرشار، عبدالحلیم شرر اور شاد عظیم آبادی کے ساتھ ساتھ خواتین میں بھی ناول نگاری کا ذوق پید ہوا۔ سرزمین عظیم آبادی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اردو کی اولین خاتون ناول نگار کا تعلق اسی خطے سے ہے۔ یعنی محترمہ رشیدۃ النساء (ناول اصلاح النساء) یہیں پٹنہ کی رہنے والی تھیں۔ یہ ناول ۱۸۹۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا تھا اسی طرح اردو کا ابتک کا سب سے کامیاب، مکمل اور دلچسپ ناول ''امراؤ جان ادا'' مصنف مرزا ہادی رسوا ہے۔ یہ ناول ۱۸۹۹ء میں پہلی بار شائع ہوا اور ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ہنوز اس ناول کی مقبولیت قائم ہے۔ دراصل اس کا قصہ اتنا مزیدار اور پُر لطف ہے کہ قاری کا تجسس اخیر تک برقرار رہتا ہے۔ حالانکہ اس کے بعد قصہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو میں بے شمار ناول لکھے گئے۔ نت نئے موضوعات کا انتخاب کیا گیا اور دوسری زبانوں کے ادب سے بھی اثرات قبول کئے گئے۔

وقت کے بدلتے دھارے کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر فنون کے علاوہ ادب میں بھی تبدیلی رونما ہوئی اور اس کے اثرات دور تک پھیلے۔ اردو ادب بھی اس تبدیلی سے اچھوتا نہیں رہا۔ ایک نئی صنف وجود میں آئی جسے طویل مختصر افسانہ RNG Short Story کا نام دیا گیا۔ یہاں بھی ناول نگاروں کی طرح افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ابدیت انہی کو ملی جن کے یہاں قصہ گوئی یا کہانی میں ندرت تھی۔ اس ضمن میں علی محمود، راشد الخیری، پریم چند، اختر اور ینوی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی سلطان حیدر جوش، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں، یہاں نام کی فہرست بنانا مقصود نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ وہی کہانیاں باقی رہ گئیں جنہوں نے قصہ نگاری کی روایت سے استفادہ کیا۔ ورنہ علامتی یا تجریدی کہانیوں کو تو زوال آگیا۔ افسانچے یا منی کہانیاں لکھی گئیں مگر دوام کو نہ پہنچ سکیں۔ اردو میں قصہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں صرف نثر نے نہیں بلکہ شاعری نے بھی اہم رول ادا کیا۔ اردو میں منظوم قصے موجود ہیں اور مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ مثلاً قطب مشتری، علی نامہ، پھول بن، قصہ چندر بدن ومہیار، قصۂ گل بکاؤلی، سحر البیان، گلزار نسیم، زہر عشق، فریب عشق، گھر کا حال وغیرہ وغیرہ۔

اردو ڈراموں میں قصہ پن ہی اصل بنیاد ہے۔ تصادم اور کشمکش کی بنا پر کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ڈراموں سے فلموں اور ٹی۔وی سیریل تک بات پہنچتی ہے اور قصہ نگاری کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

اس طرح اردو میں قصہ نگاری کی روایت زینہ بہ زینہ آج دور جدید میں بھی اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کیونکہ قصہ گوئی یا کہانی پن ہی اصل بنیاد ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، فلم یا سیریل کوئی بھی دوام حاصل نہیں کرسکتا۔

اردو زبان میں قصہ نگاری کی روایت

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم
معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

اردو میں قصہ گوئی کی روایت بہت قدیم ہے۔ عہد قدیم میں قصے، حکایتوں اور داستانوں کے ذیلی و ضمنی واقعات پر مشتمل ہوتے تھے۔ بقول پروفیسر گیان چند جین: پرانے قصوں کے چار اہم موضوعات تھے۔ جانوروں کی کہانیاں، سحر، جنس اور جنگ وجدال، لیکن مذہب اور اخلاق بھی اہم موضوعات رہے ہیں جن کا مصنف مذکور نے ذکر نہیں کیا ہے۔ اُن قصے کہانیوں میں بجا طور پر قدیم سنسکرت اور یونانی ورومن قصوں سے کسی نہ کسی طرح استفادہ نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ عرب اور ایران کی قصہ گوئی کے واضح نقوش بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہاں صرف اردو میں قصہ گوئی کی روایت ہمارے پیش نظر ہے۔

دکن میں شکارنامے کو چھوڑ کر چودھویں سے لے کر اٹھارہویں صدی تک نظم ونثر پر مبنی تخلیقات کا سراغ ملتا ہے۔ اس دوران جو کتب ورسائل منصۂ شہود پر آئے وہ اردو کی اولین تصنیفات قرار پائے۔ اُن چار سو برسوں کے بیچ جو کتابیں تصنیف ہوئیں وہ زیادہ تر مذہبی، اخلاقی اور دینی نوعیت کی تھیں۔ اُن میں تصوف اخلاقیات اور مذہبی ودینی امور پر زیادہ زور ملتا ہے۔ اُس دور میں خیالی یا اختراعی قصوں کا رواج بہت کم تھا۔ صرف دو تصانیف ''سب رس'' اور ''طوطی نامہ'' ایسی ملتی ہیں جن میں قصے کہانیوں کا پتہ چلتا ہے، اُن میں بھی اکثر مقامات پر مذہبی اور اخلاقی رجحان ومزاج کا عمل دخل تھا۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں شمالی ہند اردو کے اہم مرکز کے بطور اُبھرا۔ لیکن یہاں بھی حسب روایت قصوں میں مقصدی اور تعمیری رجحان قائم رہا۔ اس ضمن میں یہاں جو اہم تصنیف سامنے آتی ہے، وہ ہے کربل کتھا (۱۷۳۳ء) یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ ہے۔ فضلی کی نثر پر اگرچہ عربی اور فارسی کے اثرات زیادہ تھے، اور عبارت آرائی کے دوران وہ قافیہ پیمائی اور رنگینیٔ بیان پر زیادہ زور صرف کرتا تھا۔ لیکن قصے بیان کرنے کے دوران وہ رفتہ رفتہ صاف ستھری نثر کی طرف مائل ہوتا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کربل کتھا میں دقیق اور رنگین طرز کے ساتھ ساتھ سلاست اور صفائی بھی متوازی طور پر ایک جگہ ساتھ نظر آتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اردو میں قدیم قصہ گوئی کے ابتدائی اور باضابطہ نمونوں میں ''سب رس'' (۱۶۳۵ء) کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ فضلی کے کربل کتھا کی طرح یہ بھی طبع زاد نہیں تھا۔ ملا وجہی نے اسے فارسی قصے ''حسن ودل'' سے ترجمہ کیا تھا۔ لیکن یہ وجہی کا اختصاص تھا کہ اس نے اصل میں ادنیٰ سا تصرف کر کے اپنی کمال ہنرمندی کے ساتھ قصے کو اس انداز میں بیان کیا کہ یہ اصل کتاب پر سبقت لے گیا اور اس پر طبع زاد کا گمان ہونے لگا۔ فرضی قصے کی صورت میں عشق وعقل اور حسن ودل کے معرکے بیان کرنے کے دوران اس نے مختلف تمثیلی کرداروں اور ان کے جذبات واحساسات کو اس

طرح پیش کیا کہ یہ متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ ملاحظہ کریں چند سطور:

''ایک شہر تھا، اُس شہر کا ناؤں سیتاں، اس سیتاں کے بادشاہ کا ناؤں عقل، دین و دنیا کا تمام کام اس سے چلتا۔ اُس کے حکم باج ذرّا کیں نہیں ہلتا۔ اُس کے فرمائے پر جنو چلے، ہر دو جہاں میں ہوئے پھلے دنیا میں کہوائے، چار لوگوں میں عزت پائے.... الحمد للہ دونوں کوں ہوا وصال، اپنا دل خوش تو سب عالم خوش حال۔ دل کوں ملیا جیو کا جانی، یُو وصال مبارک یُو خوشی ارزانی...''

اس دور کے دوسرے نثری قصوں میں ملا سید محمد قادری کا ''طوطی نامہ'' خاصا معروف ہے، یہ الف لیلہ اور کلیلہ و دمنہ کی طرح مشہور ہوا۔ ابتدائی صورت میں اس کے ۵۲ رقصوں کو مولانا ضیاء الدین بخشی بدایونی نے مرتب کیا۔ لیکن زبان مشکل اور ادق تھی۔ اس لئے سید محمد قادری نے اسے سہل اور بامحاورہ زبان میں لکھا۔ مؤلف داستان تاریخ اردو سید حامد حسن قادری کے مطابق اس قصے کو غواصی اور ابن نشاطی بھی لکھ چکے تھے۔ بعد میں ''طوطی نامہ'' کا خلاصہ ابوالفضل نے شہنشاہ اکبر کے حکم سے لکھا۔ اس کا ایک اقتباس دیکھیں:

''بڑھئی اور سنار اور درزی اور پرہیزگار مسافری کو نکلے۔ اور ایک رات بیچ جنگل دہشت بھرے ہوئے کہ پتا باگاں کا ڈر سین سے اس جنگل کا پانی ہوتا تھا۔ یکا یک اپنا اس جاگاہ میں پڑا لینی ہوا۔ وہ چاروں یار مصلحت کرے کہ ہم ہر ایک کو موافق باری کے ایک ایک پہر نگہبانی کرے ۔ اول بڑھئی جاگتا تھا۔ لکڑی ایک بیچ نہایت بہتری صورت کے چھلیاں یعنی اچھی صورت بنایا اور پھر دو گھڑی سنار اس کے تین زیور سیں سنوارا یا۔ تیسری پہری میں درزی اس کے میں سات لباس کے زینت دار کیا۔ چوتھی پہری میں زاہد موں عاجزی کا طرف قبلہ کے لایا۔ دعا کیا اور جان بیچ بدن اس کے پھو کے گیا ہوا۔۔۔''

درج بالا اقتباس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند اسماء اور ضمائر کو چھوڑ کر زبان خاصی سہل اور رواں ہے۔ ساتھ میں کہانی پن کی خصوصیت بھی موجود ہے، اسلئے قصے کی دلچسپی اخیر تک برقرار رہتی ہے۔

سب رس، کربل کتھا اور طوطی نامہ کئی تصنیف کے عرصے بعد فورٹ ولیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کالج کا مقصد سہل اور سلیس زبانوں میں کتابوں کا ترجمہ کرانا تھا۔ تا کہ اہل ہند اور اہل یورپ اسے بہ آسانی سمجھ سکیں۔ اس منشا کے تحت جان گل کرائسٹ نے کالج میں کئی منشیوں کا تقرر کیا۔ اس کالج کی مساعی سے میر امن نے ''باغ و بہار'' کی تالیف کی اور شہرت کی بلندی پر پہنچے۔ باغ و بہار پہلی دفعہ ۱۸۰۳ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔ میر امن نے اس کے قصے عطا حسین کی نوطرز مرصع سے اخذ کئے تھے لیکن اپنی طرف سے یہ خوبی پیدا کی کہ ادق اور بھاری بھرکم عبارتوں کی جگہ سہل اور برجستہ زبان کو ترجیح دی۔ اور بہتیری عبارتوں کو حذف کیا اور اپنی اختراعی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ غرضکہ میر امن کی کوششوں نے اس کتاب کو اس حد تک دلچسپ اور مقبول بنا دیا کہ اس کے ترجمے انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور لاطینی جیسی اہم زبانوں میں ہوئے۔ اس قصے کا ایک مختصر

حصہ یہاں نموتاً پیش کیا جاتا ہے تا کہ اردو میں قصے کی روایت کے آغاز وارتقاء کی بابت واقفیت ہو سکے۔

’’ کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پہونچایا کسو شخص نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گذری ......جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب عقاب کے پنجے میں سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا ....یک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا۔ سائل نے پھر سوال کیا، اس کا کیا سبب ہے ....بولے کہ ایک میدان میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دنوں دوپہر کی دھوپ میں تونسا ہوا اس کے سایہ میں آنکر بیٹھا.......خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدل دعا کی، اس کا تیر قبولیت کے نشانے پر درست بیٹھا۔ میری آمرزش ہوئی اور جہنم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفے میں رہنے کا حکم ہوا۔

’’باغ و بہار‘‘ کی اس پر کشش اور سہل تالیف کے بعد حیدر بخش حیدری کی ’’ آرائش محفل‘‘ کو بھی شہرت دوام حاصل ہوئی۔ آرائش محفل کے قصے بھی نہایت دلچسپ، سلیس اور روزمرہ کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ نمونہ دیکھیں ’’چند روز بعد جب وہ لڑکی شعوردار ہوئی تو اپنے ذہن کی رسائی اور نیک بختی کے باعث سے دائی سے کہا کہ اے مادر مہرباں، دنیا مانند حباب ہے۔ اس قدر دولت تنہا لیکر میں کیا کروں گی۔ مصلحت یہی ہے کہ اس کو خدا کی راہ میں لٹادوں اور آپ کو آلائش دنیاوی سے پاک رکھوں اور شادی نہ کروں بلکہ خدا کی یاد میں مصروف رہوں۔ اس واسطے تم سے پوچھتی ہوں کہ اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں جو مناسب جانو کہو۔ دائی نے کہا۔ اے جان پدر تو ان سات سوالوں کا اشتہار لکھ کر دروازے پر چپکا دے اور یہ کہہ کہ جو کوئی میرے ساتوں سوال پورے کرے گا میں اسے قبول کروں گی......‘‘

اور جب دائی نے ان سات سوالوں کے متعلق بتایا تو حسن بانو بہت خوش ہوئی اور دل میں کہا کہ وہ کون ایسا شخص ہوگا جو ان ساتوں سوالوں کے جواب دے گا۔ آگے کا قصہ طویل لیکن اس طرح دلچسپیوں سے بھرپور ہے کہ اس کے سحر میں آئے بغیر کوئی بھی قاری نہیں رہ سکتا۔ حیدری کی دوسری تصانیف میں ’’گل مغفرت‘‘ کو نقش آخر کا درجہ حاصل ہے۔ یہ بھی ’’روضۃ الشہداء‘‘ سے استفادہ ہے۔ اس میں واقعات کربلا کو بہت ہی مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ میر امن اور حیدر بخش حیدری بلاشک وشبہ بڑے قصہ گو تھے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ میر امن چھوٹے چھوٹے جملے، ہندی الاصل الفاظ اور روزمرہ کو برتنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جب کہ حیدری عربی، فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ روزمرے اور محاورے کا استعمال بھی کم ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک اہم قصہ گو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سلسلے کے ایک اہم قصہ گو شیر علی افسوسؔ بھی تھے۔ انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں دوران ملازمت ایک کتاب ’’باغ اردو‘‘ (۱۸۰۳ء) ترتیب دی۔ افسوس کے یہاں اگرچہ حیدری اور میر امن کے مقابلے مفرس اور معرب الفاظ، اضافتیں اور ترکیبیں زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود ایک کشش ہے جو ہر جگہ اپنی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے۔ گلستاں سعدیؔ کے

ترجمے کے دوران وہ اکثر اپنی بول چال اور روزمرے سے دور جا پڑے ہیں، لیکن ایک فن کاری یہ کی ہے کہ سعدی کے مشہور مقولے اور ضرب الامثال کو ہو بہو منتقل کر دیا ہے، اور اردو میں آکر بھی یہ کافی دلچسپ اور اثر انگیز ہیں "باغ اردو" سے ذیل کا حصہ ملاحظہ فرمائیں:

"کہتے ہیں کہ نوشیرواں عادل کے واسطے لوگ شکارگاہ میں ایک شکار کے کباب بھونتے تھے، نمک موجود نہ تھا۔ لوگوں نے زمیندار کے پاس آدمی بھیجا کہ نمک لے آؤ۔ نوشیرواں بولا کہ نمک قیمت دے کر لی جیو تا کہ رسم نہ بگڑ جائے۔ لوگ بولے اے بادشاہ! اتنی سی بات سے کیا خلل پیدا ہوگا۔ نوشیرواں نے کہا اولاً ظلم کی بنیاد تھوڑی ہی سی تھی، جو آیا اس پر بڑھاتا گیا حتیٰ کہ اس درجہ پہونچ گئی کہ۔"

جو کھائے شاہ رعیت کے باغ سے ایک سیب
غلام اس کے درختوں کو ڈالیں جڑ سے اکھاڑ
جو آدھے انڈے پہ سلطاں ستم روا رکھے
سپاہی سیخ پہ بھونیں ہزار مرغ پچھاڑ

"باغ اردو" کے بعد ہفت گلشن بیتال پچیسی اور شکنتلا جیسے اہم اور دلچسپ قصے اردو کے قالب میں ڈھالے گئے۔ اس میں ہفت گلشن کو چھوڑ کر دونوں کتابیں اصلاً سنسکرت میں ہیں، لیکن اردو میں منتقل ہو کر بھی یہ اُتنی ہی مقبول رہے۔

اردو میں قصے کی ایک بہت ہی مستحکم اور مقبول روایت داستان امیر حمزہ سے قائم ہوتی ہے۔ اس کے قصے خلیل علی خاں اور عبداللہ بلگرامی نے پہلے پہل ترتیب دیئے تھے۔ لیکن مطبع نول کشور کے ایماء پر سید تصدق حسین نے اس کو نئے سرے سے لکھا وہ "فسانۂ عجائب" کا زمانہ تھا۔ فسانہ کی رنگین عبارتوں کی دھوم تھی، باغ و بہار کے جواب میں تخلیق کی گئی اس داستان کے سامنے داستان امیر حمزہ جیسی داستان تھی جس کا مقابلہ ممکن نہ تھا۔ امیر حمزہ کو تصدق حسین نے شاعرانہ صنعت گری کا عجائب خانہ بنا دیا۔ اسکے طول طویل قصوں میں ہندوستانی رسم و رواج اور مختلف احوال و کوائف کو شامل کر کے ہندوستانی عوام کے مذاق کے مطابق بنایا۔ بعد میں اس قصے کو مزید وسعت دیکر "طلسم ہوشربا" کی متعدد ضخیم جلدیں تیار کی گئیں۔ اس قصے کا آغاز ملاحظہ کریں۔ یہاں مقفیٰ اور مسجع عبارتوں نے کیا حسن پیدا کیا ہے:

"نخل بندان بوستان اخبار، چمن پیرایان گلستان، تختۂ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع بموقع نصب فرماتے ہیں، صحن شفاف قرطاس کو گل دریا چین مضامین رنگارنگ سے یوں رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار ہوا نمونہ بہشت شداد نمودار ہوا۔ النقش خوشی سے پھول گیا۔ فکر دارین بھول گیا۔"

اردو کی بڑی اور اہم داستانوں میں بوستاں خیال، کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد کا قصہ ہے۔ اس کے مصنف میر محمد تقی ہیں۔ اردو میں اس کے پہلے مترجم خواجہ امان دہلوی ہیں لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند خواجہ قمر الدین خان نے اسے مکمل کیا۔ بوستاں خیال کے ترجمے لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں نے اپنے اپنے طور پر کئے۔ تھوڑے سے لب و لہجے اور انداز و آہنگ کے فرق کے ساتھ پوری داستان بہر طور نہایت دلچسپ، تحیر کن اور پرکشش ہے۔ سید نادر علی نے اس داستاں میں خلاف تہذیب الفاظ اور واقعات کو حذف کر کے اس طرح بنایا کہ عورتیں اور بچے بھی پڑھ سکیں۔

نمونتاً اس کا ایک قصہ دیکھیں۔

"اس اثنا میں شام ہوگئی۔ ناگاہ چند کنیزیں بہ لباس تکلف باغ میں آئیں، اور انہوں نے بالاتفاق کہا کہ اے شہریار، آفریں ہے تم کو۔ تم کسی کنیز و خواص سے مختلط نہ ہوئے۔ ہرگاہ تمہارا استقلال مزاج ہماری ملکہ نے سنا ہے۔ دل و جان سے تم پر عاشق ہوگئی۔ اس کا کلمہ ختم کرنے کے بعد ایک نازنین... اس شکل و صورت کی باغ میں آئی کہ اگر فرشتہ بھی ایک نظر دیکھتا، قوت ملکوتی سلب ہو جاتی۔ شہزادہ بے قرار ہو گیا۔ لیکن اس مکان سراپا فساد کے خوف سے کچھ دم نہ مارا اور جلد جلد اسم اعظم کا ورد کرنے لگا..."

بوستان خیال اور امیر حمزہ وغیرہ کے بعد روایتی قصے کہانیوں کا ایک طویل سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ قصہ گویوں کے یہاں ایک مشترک رواج یہ ہے کہ وہ یا تو اپنی قدیم روایت اور کلچر سے قصے کشید کرتے ہیں یا کسی نہ کسی معروف فارسی، عربی یا سنسکرت تصنیفات کا اپنے انداز و آہنگ میں ترجمہ کرتے ہیں۔ مقصد حسن و کشش کے گل بوٹے کھلانا ہوتا ہے۔ اس قبیل کے دوسرے قصوں میں قصہ گل بکاؤلی، چہار قصہ، افسانہ ہندی، لیلیٰ مجنوں، قصہ بندگانِ عالی، حکایت ہائے عجیب و غریب، قصہ بہروز سوداگر، قصہ حیرت افزا، مذہب عشق، قصہ گل و ہرمز، قصہ قاضی چور، قصہ پوستی و بھنگی، قصہ چہار باغ، قصہ رضوان شاہ، قصہ چترلیکی انوار سہیلی، شگوفۂ محبت، سہراب و رستم وغیرہ سامنے کی مثالیں ہیں۔ ان قصے کہانیوں کی فی زمانہ کشش اور اہمیت رہی ہے۔

لیکن اردو میں قدیم قصے کہانیوں کی روایت اس وقت اپنا لبادہ اتار کر نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے جب خاص اصلاحی اور تعمیری مقصد مادی ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے مصنفین میں ڈپٹی نذیر احمد کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ڈپٹی نذیر کے بعد ان قصوں کا ایک واضح مقصد سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، سرسید احمد خاں وغیرہ کے نام آتے ہیں جنہوں نے اپنی کوششوں سے کہانیوں کی سمت و رفتار متعین کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

مختصر یہ کہ اردو ادب میں قصے کہانیوں کی قدیم روایات کے غائر مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قبیل کی تحریریں زیادہ تر دلبستگی اور تفریح طبع کی غرض سے لکھی جاتی تھیں۔ معدودے چند اخلاقی اور تعمیری قصوں کو چھوڑ کر کوئی واضح اور صحتمند مقصد سامنے نہیں تھا۔ بادشاہ، نوابین، امراء اور روساء وغیرہ کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف اور ان کے جھوٹے معاشقے اور معرکے کی طول طویل داستانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ اور اسکے پس پشت یہ نیت کارفرما تھی کہ زبان دانی کا سکہ بھی چل جائے گا اور مالی اعانت بھی حاصل ہو جائے۔ گویا یہ قصے ایک طرح سے نثر میں قصیدے تھے جن کی تان حسنِ طلب پر ٹوٹتی تھی۔ اسلئے ان قصوں کا کوئی افادی اور دوررس نصب العین نہیں تھا۔ لیکن ادب میں اس لحاظ سے ان قصوں کی اہمیت مسلم قرار پائی کہ ان کے ابتدائی نقوش کو ہی دیکھ کر آئندہ کے قصہ گویوں اور افسانہ نگاروں نے اپنے لئے نئی راہ متعین کی اور اپنے فن پاروں کو خوب سے خوب تر بنانے میں کامیاب ہوئے۔ آج اردو کے قدیم قصے ترقی کر کے اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے پوری دنیا کا سچا اور حقیقی مشاہدہ اور تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا آج قدیم قصے کہانیوں کی افادی اور تعمیری حیثیت جو بھی ہو لیکن ان کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اردو قصہ نگاری پر عربی کے اثرات

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی
پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

کہانیاں اور قصے لکھنا ادب کے گراں قدر فنون میں سے ایک فن ہے۔اس کے ذریعہ فکر کو کھیل کود اور تفریحی باتوں میں مشغول کر کے نفس کی کدورت دور کی جاتی اور اسے سکون وآرام پہنچایا جاتا ہے۔ نیز پر حکمت باتوں سے عقل کی اصلاح وتربیت کی جاتی ہے۔یورپ میں تو اس فن کو نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔اور اس کے لئے اصول وضوابط مقرر ہیں۔(۱)

قصہ کہنا اور سننا انسان کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔کسی زمانے میں دن بھر کا تھکا ماندا انسان رات میں دوستوں کے حلقہ میں بیٹھتا کچھ دوسروں کی سنتا جسے جو یاد ہوتا وہ سناتا اور کوشش کرتا کہ وہ توجہ کا مرکز بنا رہے۔اس کیلئے قصہ سے زیادہ دلچسپ اور کیا ہوسکتا تھا۔اس طرح قصہ نے جنم لیا۔

قصہ کہانی صرف دلچسپی کا ذریعہ نہیں بلکہ اس میں سننے والے اور سنانے والے دونوں کیلئے عبرت ہے۔اس کے سننے سنانے سے بھلے ہی اخلاقی درس دینا مقصود نہیں رہا ہو لیکن ان قصوں اور کہانیوں سے ہمیں کوئی نہ کوئی درس ضرور ملتا ہے۔ ہ دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ حق کی فتح اور باطل کی شکست ہوتی ہے اس میں نیکی اور اچھائی کی ترغیب پوشیدہ ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمانہ جاہلی میں قصہ کہانیوں کا بہت رواج تھا۔ یہ کہانیاں دو قسم کی ہوتی تھیں ۔ ایک لوک کتھا تھی جس کا موضوع جنگ اور ر بہادروں کی شجاعت اور جنگی کارناموں کا ذکر تھا جیسے عنتر ہ یا الزیر سالم بن بلال وغیرہ کے قصے۔دوسری قسم ان کہانیوں کی ہے جسے عربوں نے دوسری قوموں سے لیکر عربی رنگ میں ڈھال کر بیان کیا ہے جیسے شریک نامی ایک شخص کا قصہ کہ دراصل یہ کہانی ایک یونانی کہانی ہے جسے عربوں نے اپنے رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ بالکل عربی کہانی لگتی ہے۔(۲)

عربی میں قصہ کہانیوں کا سب سے اہم ماخذ اور مضبوط بنیاد قرآن کریم میں موجود ہے جس میں نبیوں کے قصے، مختلف اقوام کے قصے اور مختلف شہروں کے واقعات کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے ذریعے عبرت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔قرآن کریم میں بہت سے قصے بیان کئے گئے ہیں ان میں سے صرف حضرت یوسفؑ کے سلسلے میں جو قرآن میں درج ہے اس کا ترجمہ پیش ہے۔

یہ کتاب روشن کی آیتیں ہیں ہم نے اس قرآن کو عربی

میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو (اے پیغمبر! ہم اس قرآن کے ذریعے سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے تمہیں ایک نہایت ہی اچھا قصہ سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے جب یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا کہ ابا میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا۔ دیکھتا (کیا) ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں انہوں نے کہا کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا نہیں تو وہ تمہارے حق میں کوئی فریب کی چال چلیں گے۔ کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور اسی طرح خدا تمہیں برگزیدہ (وممتاز) کرے گا اور (خواب کی) باتوں کی تعبیر کا علم سکھائے گا اور جس طرح اس نے اپنی نعمت پہلے تمہارے دادا، پردادا ابراہیم اور اسحاق پر پوری کی تھی اسی طرح تم پر اور اولاد یعقوب پر پوری کرے گا۔ بیشک تمہارا پروردگار (سب کچھ) جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ ہاں یوسف اور ان کے بھائیوں (کے قصے) میں پوچھنے والوں کیلئے (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ جب انہوں نے (آپس میں) تذکرہ کیا کہ یوسف اور اس کا بھائی ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم جماعت (کی جماعت) ہیں۔ کچھ شرط نہیں کہ ابا صریح غلطی پر ہیں تو یوسف کو (یا تو جان سے) مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک آؤ۔ پھر ابا کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد تم اچھی حالت میں ہو جاؤ گے۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو جان سے نہ مارو کسی گہرے کنویں مین ڈال دو کہ کوئی راہگیر نکال (کر اور ملک میں) لے جائے گا اگر تم کو کرنا ہے (تو یوں کرو، یہ مشورہ کر کے وہ یعقوب سے) کہنے لگے کہ ابا جان کیا سبب ہے کہ آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے خوب میوہ کھائیں اور کھیلیں کودیں ہم اس کے نگہبان ہیں انہوں نے کہا کہ یہ امر مجھے غم ناک کئے دیتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ (یعنی وہ مجھ سے جدا ہو جائے) اور مجھے یہ بھی خوف ہے کہ تم (کھیل میں) اس سے غافل ہو جاؤ اور اسے بھیڑیا کھا جائے، وہ کہنے لگے کہ اگر ہماری موجودگی میں کہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں اسے بھیڑیا کھا گیا تو ہم بڑے نقصان میں پڑگئے، غرض جب وہ اس کو لے گئے اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اس کو گہرے کنویں میں ڈال دیں تو ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی (ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم ان کو اس سلوک سے آگاہ کرو گے اور ان کو) (اس وحی کی) کچھ خبر نہ ہوگی (یہ حرکت کر کے) وہ رات کے وقت باپ کے پاس روتے ہوئے آئے (اور) کہنے لگے ابا جان ہم تو دوڑنے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف ہوگئے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا، اور آپ ہماری بات کو گو ہم سچ ہی کہتے ہوں باور نہیں کریں گے اور ان کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا لہو بھی لگا لائے یعقوب نے کہا کہ حقیقت حال یوں نہیں ہے بلکہ تم اپنے دل سے (یہ) بات بنا لائے ہو۔ اچھا صبر (کہ وہی) خوب (ہے) اور جو تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں خدا ہی سے مدد مطلوب ہے۔ (۳)

حضرت یوسفؑ کے اس واقعہ کو قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قصے ہیں جن کو عبرت کیلئے قرآن کریم میں ضرورت کے مطابق

بیان کیا گیا ہے۔ یہی قصے بعد میں ادبی قصہ و داستان نگاری کے لئے بنیاد بنے۔

عربی ادب میں نثر نگاری اور قصہ نویسی کا وجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ابن مقفع نے نثر نگاری اور قصہ نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ پھر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے کلیلہ و دمنہ، ہزار افسانہ (الف خرافہ)، دارا اور الصنم الذہب، وغیرہ جیسی کتابوں کے تراجم کئے، جن سے عربوں کو اس قسم کی تصانیف کا شوق پیدا ہوا اور یہ تراجم ان کیلئے نمونہ بنے۔

جب عربوں میں آسودگی اور عیش کوشی بڑھی، اور عجمیوں نے خلفاء کے بار خلافت کو اٹھا لیا، تو خلفاء شراب نوشی اور قصہ گوئی کی محفلوں میں رات بسر کرنے لگے۔ پھر کیا تھا مصاحبین اور منادمین نے قصے یاد کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلے شروع کردیئے۔ تیسری اور چوتھی صدی کے ادیبوں نے قصے لکھنے اور انہیں خواص میں زبانی سنانے میں مسابقت شروع کردی۔ ان کی تقلید میں آرام پرست خوشحال عوام کو بھی اپنی محفلوں اور مجلسوں میں شادیوں اور دیگر اجتماعات میں قصہ گویوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور جوں جوں عہد بنی عباس کے آخر میں عالم اسلامی پر مشکلات و مصائب کا دور آنے لگا اور اس کے بعد سلجوقی مستبد حکمرانوں اور ظالم مغل بادشاہوں کا زمانہ آیا اس کی طلب اور زیادہ شدید ہوتی گئی۔ مصری عوام بیکاری و فحاشی اور منشیات (بھنگ اور افیون) کے عادی ہو چکے تھے، چنانچہ ان کے پاس قصہ گو پہونچے جن کی حیثیت ان کے لئے بادشاہوں کے مصاحبین کی سی ہوئی۔ یہ انہیں بہادروں کے قصے، جنات کی کہانیاں، جادوگروں کی شعبدہ بازیاں اور دیگر نسلاً بعد نسل بیان کئے جانے والے واقعات و حوادث ملک کے سیاحوں اور تاجروں کے مشاہدات وغیرہ بیان کرتے۔ پھر ان قصے کہانیوں میں من گھڑت اضافے اور مبالغہ آرائیاں ہوئیں اور مدت دراز گذرنے کے سبب ان کے بنانے والوں کے نام بھلا دیئے گئے جس طرح قدیم یورپ کی کہانیوں کے لکھنے والوں کے نام معلوم نہ رہے، چنانچہ ان عربی کہانیوں میں عنترہ کا قصہ ہے۔ مزید برآں بنی بلال، سیف بن ذی یزن، الامیرۃ ذات الہمۃ، الظاہر بیبرس، علی زیبق مصری، فیروز شاہ کی کہانیاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمام کہانیاں پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدیوں میں مصر میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بعض صلیبی جنگوں کے زمانے کی ہیں اور بعض سقوط بغداد کے دور کی۔ مصر میں لکھے جانے کے ثبوت میں ان کہانیوں کے مقامات، حادثوں کے موضوعات اور ان کے کرداروں کے نام بین شہادت ہیں، نیز ان کی مخلوط زبان اور مبتذل اسالیب اس امر کے غماز ہیں کہ اس کا زمانہ پانچویں صدی ہجری تک کا ہے۔ اس زمانہ کی اجتماعی حالت اور صلیبی جنگوں کے سلسلے نے انہیں یہ قصے لکھنے پر ابھارا تاکہ جنگ کا وصف، بہادری کی مدح، رہنماؤں اور جنگی افسروں کی عزت افزائی، اور فوجیوں کو بے دھڑک جنگ میں حصہ لینے کی ترغیب کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ تقریباً وہی طریقہ تھا جو پہلی صدی ہجری کے مسلمان بھی اختیار کرتے تھے۔ یہ اسباب تھے جنہوں نے عربی قصے کہانیوں کو جنم دیا اور تقریباً ایسے ہی واقعات تھے جن میں یہ مغرب میں پیدا ہوئے۔ (۴)

اس طرح قصہ نگاری کا فن بنو امیہ کے زمانے میں وجود

میں آیا اور اس فن کو عربوں نے ایران سے لیا جیسا کہ تاریخ ادب عربی میں مذکور ہے۔

''حکایات کا فن عربوں نے ایرانیوں سے اخذ کیا، اس سلسلہ میں ان کے یہاں جو بہترین مواد تھا وہ سعدی کی گلستاں اور الف لیلہ کی اصلی کتاب تھی۔ اور یہی دونوں کتابیں مشرق ومغرب میں اس فن کی مثالی کتابیں شمار کی جاتی ہیں۔ لیکن عربوں نے جب یہ چیزیں ایرانیوں سے لیں تو انہوں نے اس قدر اضافے کئے اور اتنا دسترس حاصل کرلیا کہ وہ اس میدان میں ان کے حریف وسہیم ہوگئے بلکہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اولیت ہی ان کو حاصل ہے۔ انہوں نے ایرانیوں سے جو الف لیلہ لی تھی اس میں اس قدر اضافے کئے کہ وہ اصل کتاب پر چھاگئے اور یہ کتاب ادب عربی کا ایک بلند شاہکار بن گئی۔

الف لیلہ کی اصل کے متعلق اغلب یہی ہے کہ وہ فارسی کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی جسے ''ہزار افسانہ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے ایک بادشاہ، وزیر اور اس کی بیٹی شہرزاد اور اس کی کنیز دنیازاد کی حکایات بیان کی ہیں۔ عربوں نے تیسری صدی ہجری کے آخر میں یہ کتاب فارسی سے عربی میں ترجمہ کی۔ پھر اس کی مقبولیت نے انہیں اس کی توسیع وتفریع پر مائل کیا چنانچہ انہوں نے اس میں اس سے مشابہ قسم کی عربی، ہندوستانی اور یہودیوں کی کہانیاں، خلفاء وامراء کے واقعات، زمانۂ جاہلیت و اسلام کے بہادروں اور سخاوت کرنے والوں کے قصے جوڑ دئے اور ان اضافوں کا دروازہ دسویں صدی ہجری تک کھلا رہا، اور اس طرح اس میں جو کمی رہ گئی تھی وہ سب پوری ہوگئی۔ ایرانیوں کی اصل کتاب کے خال خال اثرات رہ گئے بلکہ یوں کہئے کہ عربوں نے اس میں جنات اور جانباز بہادروں کے قصے، غیبی آوازوں کے مکالمے، جادوگروں کی کارستانیاں جس دلچسپ جاذب طبع اور مفید خاطر انداز میں بیان کئے ہیں اس سے وہ فارسی والا حصہ تقریباً نابود ہوگیا ہے۔

اس کتاب کی نمایاں فضیلت اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ شام ومصر وعراق کے اسلامی دور کے عصور وسطی میں عربوں اور مسلمانوں کے اخلاق وعادات، رسوم ورواج، اور ان کے مختلف نظامہائے حیات کی ایسی ترجمانی کرتی ہے جس سے اجتماعیات کا مطالعہ کرنے والے ادیب اور فلسفی مورخ کو بڑی مدد اور گرانقدر مواد ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ والوں نے اس پر خصوصی توجہ دی اور اس کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ اس کے بیانات کو بحث وتحقیقات کا موضوع بنایا۔ اس کتاب کی طرز نگارش مختلف ملکوں میں ہونے کی وجہ سے یکساں نہیں ہے۔ وہ حصہ جو اخبار عرب اور نوادر خلفاء سے متعلق ہے نیز وہ ترجمہ جو صدر اول میں ہوا، اس کا بڑا حصہ صحیح اور فصیح ہے۔ لیکن وہ حصہ جو بعد میں آنے والے مصروشام کے قصہ گویوں نے اضافہ کیا اس کی عبارت رکیک، الفاظ عامیانہ اور ترکیبیں مبتذل ہیں۔ تاہم قصوں کی روانی عمدہ اور واقعات وحوادث کا باہمی ربط پختہ ہے۔'' (۵)

الف لیلہ ولیلہ کی مختصر عبارت کا ترجمہ پیش ہے۔

اب جاننا چاہئے کہ اگلے لوگوں کے حالات ہم پچھلوں کیلئے عبرت ہیں۔ انسان کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ گذشتہ نسلوں کی کہانیاں پڑھ کر عبرت حاصل کرنی چاہئے۔

پاک ہے وہ ذات جس نے پرانے لوگوں کی کہانیاں نئے لوگوں کی عبرت کیلئے بنائیں۔

منجملہ عبرت آمیز کہانیوں کے وہ کہانیاں ہیں جن کا نام الف لیلہ ہے اور جن میں بڑے بڑے شاندار قصے اور مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

شہر یار بادشاہ اور اس کے بھائی کی کہانی

غیب کی باتیں تو خدا بہتر جانتا ہے، لیکن پرانے قصے کہانیوں میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اگلے زمانے میں بنی ساسان کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کی حکومت جزائر ہند اور چین تک تھی اور اس کے فوجیوں اور باج گزاروں اور شان وشوکت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے، ایک بڑا ایک چھوٹا، یوں تو دونوں بڑے بہادر اور شہسوار تھے لیکن بڑا، چھوٹے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ کئی ملک اس کی حکومت میں آئے اور وہ اپنی رعیت کے ساتھ بڑے عدل وانصاف سے پیش آتا تھا اور اس کی رعایا اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس بادشاہ کا نام شہر یار تھا۔ چھوٹے بھائی کا نام شاہ زمان تھا اور اس کا ملک سمرقند تھا۔

بیس سال تک دونوں بادشاہ اپنے ملکوں پر نہایت خوشی وخرمی کے ساتھ عادلانہ حکومت کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں بڑے بھائی کو اپنے چھوٹے بھائی کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ وہ جائے اور اس کے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ وزیر نے اس حکم کی تکمیل کی اور روانہ ہو گیا اور صحیح سلامت پہنچ گیا اور چھوٹے بھائی کے پاس باریاب ہو کر اسے بادشاہ کا سلام پہنچایا اور عرض کی کہ آپ کے بھائی کا آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ ان سے ملنے کیلئے تشریف لے چلیں۔

بادشاہ نے اسے بسر وچشم منظور کیا اور سفر کی تیاری کرنے لگا اور خیمے اور اونٹ اور خچر اور خدمت گار اور مددگار سفر کیلئے تیار ہو گئے۔ اس نے اپنے وزیر کو اپنا قائم مقام بنایا اور اپنے بھائی سے ملنے کیلئے نکل کھڑا ہوا۔ آدھی رات کے وقت اسے یاد آیا کہ وہ ایک چیز محل میں بھول آیا ہے اور پلٹ پڑا۔ جب وہ اپنے محل میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے بچھونے میں اس کی بیوی ایک حبشی غلام کو لئے پڑی ہے۔ یہ دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ ابھی تو میں شہر سے نکلا بھی نہیں اور یہاں ایسا واقعہ پیش آیا، اگر میں اپنے بھائی کے ساتھ ایک مدت تک رہا تو خدا جانے یہ حرام زادی کیا کچھ نہ کر گزرے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی تلوار کھینچی اور دونوں کو اسی بچھونے پر قتل کر ڈالا۔ اور فوراً وہاں سے چل دیا اور کوچ کا حکم دے دیا۔

الغرض وہ اپنے بھائی کے دارالسلطنت پہنچ گیا اور شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنے آنے کی خبر بھائی کو بھیجی۔

بھائی اس کے خیر مقدم کیلئے آیا اور صاحب سلامت کی اور بہت خوش ہوا اور سارے شہر میں چراغاں کرایا۔ اب دونوں بیٹھ کر خوشی خوشی ایک دوسرے سے بات چیت کرنے لگے۔ اس وقت شاہزمان بادشاہ کو اپنی بیوی کا واقعہ یاد آیا اور وہ دل ہی دل میں کڑھنے اور بے چین ہونے لگا اور اس کا چہرہ فق ہو گیا اور جسم مضمحل۔ جب بھائی کو اپنے ملک کے چھوٹنے کا قلق ہو۔

اسلئے اس کے متعلق پھر اور باتیں کیں۔(۶)

عرب پر ایران کے علمی، ادبی اور اجتماعی اثر کے مقابلے میں عربی زبان نے ایران پر اپنا اثر ڈالا اور دو سو سال کی مدت میں عربی زبان نے ایران میں ایسا رواج پایا کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔ اس زبان نے اتنا گہرا اور اتنا پائے دار اور اتنا ہمہ گیر اثر ڈالا کہ بہت سے ایرانی عالموں نے اس زبان میں شعر کہے۔ اس زبان میں خط و کتابت کی اور اس زبان کی ترویج اور تعلیم میں کوشاں رہے، عربوں کے قبضہ بلکہ اس کے بعد کی کئی صدیوں تک عربی زبان میں دینی کتابیں لکھتے رہے اور عربی زبان ایران کی ادبی زبان بن گئی اور کسی نے فارسی لکھنے کی طرف توجہ نہ کی۔ عربی زبان کے تسلط کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانیوں نے دین اسلام کو قبول کرلیا، اور چونکہ اس زمانے کے مسلمان قرآن کے سوا ہر کتاب کو اور عربی زبان کے علاوہ ہر زبان کو ناقابل اعتنا سمجھتے تھے۔ عربی میں فقہ، نحو، تاریخ اور سوانح پر بہترین کتابیں لکھنے والے علماء ایرانی تھے۔(۷)

اردو زبان ہندوستانی زبان ہے۔ اس میں ہر زبان کے الفاظ موجود ہیں۔ ساتھ ہی اس میں ہر زبان کے اصناف ادب سے استفادہ موجود ہے لیکن چونکہ ہندوستان میں اردو زبان سے پہلے فارسی زبان رائج تھی اور فارسی زبان کے ادیب و دانشور عربی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس لئے اردو زبان میں عربی و فارسی زبان کے اصناف سخن سے استفادہ زیادہ کیا گیا۔ اسی میں سے قصہ و داستان نگاری بھی ہے۔ یہ صرف اردو زبان میں عربی و فارسی سے ترجمہ ہو کر آیا ہے ۔ قرآن کریم، احادیث اور عربی و فارسی زبان کی کتابوں میں اس فن کا نمونہ موجود تھا۔ اسی سے اردو کے ادیبوں نے استفادہ کیا۔ اس طرح عربی زبان کا پورا اثر قصہ نگاری و داستان نگاری میں موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ افسانہ عربی زبان کے ”مقامات“ سے ماخوذ ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

اردو میں داستان گوئی کا آغاز ۱۸ ویں صدی کے اواخر سے ہوا۔ اردو میں نثر کی پہلی داستان تحسین کی نوطرز مرصع ہے۔ جو ۱۷۷۵ء میں لکھی گئی اس میں چار درویشوں کا قصہ ہے جو نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے مگر عبارت بے جان اور ثقیل ہونے کی وجہ سے مقبول عام نہ ہوسکی۔ ۱۸۰۱ء میں اسی قصہ کو زرین نے بھی نوطرز مرصع کے نام سے لکھا۔ تحسین کے مقابلے میں زرین کی عبارت کسی قدر آسان ہے مگر مقبول یہ داستان بھی نہ ہوسکی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو داستانیں خاصی تعداد میں لکھی گئیں ۔ یہاں تک کہ کالج کی اشاعتوں نے داستان پڑھنے کے شوق کو ابھارا۔ مختلف شہروں خاص کر لکھنؤ اور دہلی میں مطابع قائم ہوئے اور داستانیں چھپنے لگیں۔ ۱۸۰۱ء میں میر امن نے باغ و بہار لکھا، یہ داستان اتنی مشہور اور مقبول ہوئی کہ آج تک لوگ اس کے ادبی محاسن کے گن گاتے ہیں۔(۸)

عام طور پر مشہور ہے کہ باغ و بہار فارسی کتاب چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے۔ لیکن ”اردو کی قدیم داستانیں“ کے مصنف اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے۔

”میر امن نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ یہ قصہ ابتداء میں امیر خسرو دہلوی نے اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بیماری کے زمانہ میں ان کا دل بہلانے کے لئے کہا تھا۔ میر امن لکھتے ہیں ان کی طبیعت ماندی ہوئی

تب مرشد کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور تیارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چندروز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا کی جو اس قصہ کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں نہ تھا۔ اس کا ماخذ ہندی یا عربی ہے۔ ممکن ہے یہ امیر خسرو کی اختراع ہو کہ انہوں نے چند قصوں کی آمیزش سے ایک نئی داستان تیار کردی۔"(۹)

مذکورہ بالا حقائق سے یہ واضح ہے کہ عربی و فارسی زبان میں قصہ نگاری پر پہلے سے کتابیں دستیاب تھی۔ ان ہی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا اور پھر اس کا دائرہ وسیع ہوا اور قصہ کے دائرے سے نکل کر داستان کے فن تک جا پہنچا اور اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسی سے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا فن وجود میں آیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم داستان کے فنی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ داستان میں مندرجہ ذیل فنی خصوصیات کی ضروت ہے ۔ (۱) طوالت (۲) پلاٹ۔ (۳) منظر نگاری۔ (۴) معاشرت کی تصویر کشی۔ (۵) مافوق الفطرت عناصر۔ (۶) درس اخلاق۔ (۷) زبان و بیان۔ یہ فنی خصوصیات جو الف لیلہ ولیلہ یا دیگر فارسی کتابوں میں موجود تھی اسی کی بنیاد پر اردو قصہ نگاری و داستان نگاری کی بنیاد رکھی گئی۔ یہی نہیں بلکہ کسی فنی تخلیق سے پہلے اس صنف میں ترجمہ کیا گیا جو فارسی یا عربی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ چونکہ فارسی نے عربی ہی سے استفادہ کیا ہے۔ اسلئے فارسی سے جو ترجمہ کیا گیا اسکا بھی تعلق بالواسطہ عربی سے ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں کہ اردو قصہ نگاری پر عربی کے گہرے اثرات موجود ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ اردو قصہ و داستان نگاری کی بنیاد عربی پر ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

==========

ماخذ

==========

(۱) تاریخ ادب عربی، احمد حسن زیات صفحہ ۳۵۵

(۲) اردو انسائیکلو پیڈیا صفحہ۔ ۱۹۷

(۳) قرآن کریم سورۂ یوسف

(۴) تاریخ ادب عربی صفحہ۔ ۲۵۶

(۵) تاریخ ادب عربی صفحہ ۳۸۱

(۶) الف لیلہ ولیلہ جلد اول صفحہ ۲۔۳

(۷) تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۴۳۔۴۴

(۸) اردو کی قدیم داستانیں صفحہ ۱۳۔۱۴

(۹) اردو کی قدیم داستانیں صفحہ ۷۶

اردو قصے کا ابتدائی اسلوب

ڈاکٹر شہاب الدین اعظمی
شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ-۵

اس بات کا تعین تو آج تک نہیں ہو سکا کہ اس روئے زمین پر سب سے پہلا قصہ کس نے اور کس کو سنایا مگر یہ ماننے میں تامل نہیں کہ قصہ کہنا یا سننا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس لئے اس کا رشتہ انسانی زندگی سے بہت قدیم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قصے کی ابتدا شاید وہیں سے ہوتی ہے جہاں سے انسانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے یعنی جب انسان اپنے خیالات اور جذبات کی ترسیل پر قادر ہوا ہوگا اور اس نے اپنے تجربات دوسروں کے سامنے پیش کرنے شروع کئے ہوں گے تب ہی سے ''قصے'' کی ابتدا ہوئی ہوگی۔

اپنی ذات سے نکل کر انسان جیسے جیسے کائنات اور اس کی وسعتوں سے آشنا ہوا اس کے قصوں میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ صحرا نوردی اور خانہ بدوشی میں پیش آنے والے حادثات وواقعات، کائنات کی وسعتیں اور نیرنگیاں ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے قصے میں نہ صرف طوالت کو داخل کیا بلکہ حیرت واستعجاب، رومان اور تخیل کو بھی قصے کا حصہ بنایا۔ دھیرے دھیرے ان قصوں میں نہ صرف فوق الفطرت عناصر نے جگہ پائی بلکہ مبالغہ آرائی اور تخیلی فضا بھی اس کا جزو بن گئی۔ مافوق فطرت عناصر کا تعلق انسان کی اس فطرت سے ہے جو اس کو حیرت انگیز اور ناقابل یقین باتوں کو توجہ سے سننے پر مجبور کرتی ہے۔ کہانیوں میں ایسے عناصر کی شمولیت کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً اس زمانے میں قصہ سنانے کا مقصد محض اپنے خیالات کا اظہار نہ تھا بلکہ اپنی ذات کی تسکین اور دوسروں پر اپنی فوقیت اور برتری کا سکہ بھی جمانا تھا۔ مظاہر قدرت سے برسرِ پیکار ہونے اور ان پر فتح پانے کے بعد جب انسان اپنے ساتھیوں کو یہ روداد سناتا تھا تو اپنے احساس برتری کی تسکین کا خواہاں بھی ہوتا تھا چنانچہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اس نے قصوں میں نہ صرف مافوق الفطرت عناصر کو جگہ دی بلکہ مبالغہ آرائی اور تخیلی فضا بھی پیدا کی۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پرانے زمانے میں انسان زندگی کے بہت سے معاملات میں خود کو بہت مجبور، بیکس اور کمزور محسوس کرتا تھا وہ کبھی شیر سے شکست کھا کر زخمی ہو جاتا کبھی آندھی اور طوفان کا مقابلہ نہیں کر پاتا اور کبھی کبھی بھوت پریت کے وہمی واقعات سے خوفزدہ ہو جاتا تھا ایسی باتیں انہیں حیرت انگیز واقعات پر یقین کرنے اور مافوق الفطرت عناصر کا ذکر کرنے پر مجبور کرتی تھیں کبھی کبھی ناقابل قبول باتوں کو یقینی بنانے کے لئے بھی کسی جنات، دیو یا آسمانی مخلوق کے کردار کا سہارا لیا جاتا تھا۔ کچھ لوگوں نے ایک سبب اور بیان کیا ہے کہ پرانے قصے دراصل اس زمانے

کے لوگوں کے خواب ہیں۔ وہ لوگ ایسے خواب دیکھتے تھے جن میں نئی نئی دریافتوں اور عجیب وغریب مہمات کے سر کرنے کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ انسان کے بہت سے خواب اس کی نامکمل خواہشات کی تلافی کرتے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ زمانے میں جب لوگ سمندر کا سفر نہیں کر پاتے تھے تو خواب میں جل پری وغیرہ کے کردار کے ذریعے ایسے سفر کو طے کر لیتے تھے۔ جب دشمنوں سے ہار جاتے تو کسی دیوزاد یا غیر معمولی قوت والے عنصر کے ذریعے اپنی جیت کا یقین کر لیا کرتے تھے۔ اگر ہم پرانے زمانے کے فارغ البال اور کم مصروف انسانوں کی زندگی کو پیش نظر رکھیں تو یہ سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی کہ پرانے زمانے کا انسان اکثر وقت گزاری کے لئے بھی قصے بیان کیا کرتا تھا۔ سارے دن کا تھکا ہارا انسان جب رات میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھتا تھا یا سردیوں میں آگ کے الاؤ کے چاروں طرف گھٹنوں بیٹھ کر ٹھنڈک کے احساس کو کم کرنا چاہتا تھا تو اس وقت سوائے اس قسم کے واقعات کے کوئی اور چیز اس کے دل کو بہلانے والی نہیں ہوا کرتی تھی۔ ایسے ہی واقعات اور قصوں سے وہ دل کو بہلایا کرتا تھا، وقت بھی کاٹتا تھا اور زندگی کے مشکلات کے احساس کو بھی کم کرنے کی کوششیں کرتا تھا۔

ابتدائی قصوں کی اہمیت کیلئے صرف یہی باتیں کافی نہیں۔ پرانے قصے پرانی تہذیب، ثقافت اور رسم ورواج کا ذخیرہ بھی ہیں۔ انسانی سماج، معاشرہ، اس کا اخلاق، روایات، مذہبی اقدار، تہذیب وتمدن اور ادب غرض ہر اس چیز سے قصے کا رشتہ قائم ہے جس سے انسان کا رشتہ ہے۔ ہر قوم اور ملک کے افراد کی قدیم کہانیاں ان کے تمدن کی آئینہ دار، تہذیب کی عکاس اور ان کی قومی ومذہبی روایات اور اخلاقی اقدار کی امین ہوتی ہیں چنانچہ قوموں کے تمدن اتار چڑھاؤ، علم وادب کی ترقی، اسلوب اور زبان کی کیفیت ان کے قدیم قصوں کہانیوں میں پوری طرح جلوہ فگن نظر آتی ہے۔ اس طرح لفظ ''قصہ'' جو بعد میں ''داستان'' جیسے وسیع اور ہمہ گیر لفظ سے بدل دیا گیا باقاعدہ فنی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے ''داستان'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''داستان کہانی کی طویل، پیچیدہ، بھاری بھرکم صورت ہے۔ لیکن اپنی طوالت، پیچیدگی، بوجھل پن کے باوجود کہانی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ یہ بھی دل بہلانے کی ایک صورت ہے۔ داستان گوئی ایک دلچسپ مشغلہ ہونے کے ساتھ فنی حیثیت بھی رکھتی ہے اور ہر کس وناکس داستان گو نہیں ہو سکتا تھا''

('اردو زبان اور فن داستان گوئی'' ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۵ء ص ۱۹) یعنی داستان کا بنیادی عنصر ہے دلچسپی اور دلکشی۔ اسی لئے داستان لکھنے والوں نے دلچسپی پیدا کرنے کے کئی حربے استعمال کئے ہیں مثلاً:

☆ قصے کو جہاں تک ہو سکے طول دیا جائے تاکہ پڑھنے والا زیادہ سے زیادہ عرصے تک حقیقت کی دنیا کو بھول کر رومان اور تخیل کی دنیا کی سیر کر سکے۔

☆ مبالغہ آرائی کی جائے اور طلسمی واقعات کے ذریعہ داستان کو سحر آفریں بنا دیا جائے۔

☆ حقیقت کی دنیا سے الگ پڑھنے والے کے لئے رومان کا ایک جہان دلکش آباد کیا جائے۔

☆ الفاظ اور جملوں کے استعمال میں احتیاط کی جائے تاکہ بیان کا حسن قاری کو باندھے رکھے۔

ان حربوں میں سب سے زیادہ کارآمد اور بڑا حربہ طرز بیان ہے جس میں داستان کی دلکشی اور دلچسپی کے سارے عناصر پنہاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بقول کلیم الدین احمد ہر شخص داستان گو نہیں ہوسکتا۔ داستان گو کا الفاظ پر مکمل قدرت رکھنا بہت ضروری ہے۔

دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اور شائستہ زبانوں کی طرح اردو میں بھی داستانوں کا سراغ ابتدائی دور ہی سے ملتا ہے۔ ''کدم راؤ پدم راؤ'' جسے اردو کی پہلی منظوم داستان خیال کرنا چاہئے ۸۶۵ھ مطابق ۳۵۔۱۴۲۱ء کے قریب وجود میں آئی ہے لیکن نثری داستانوں کا آغاز ''سب رس'' سے ہوتا ہے جو (۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) میں لکھی گئی۔ اس تاخیر کے باوجود جلد ہی داستان اردو نثر کی اہم ترین صنف بن گئی خصوصاً اردو کی ادبی اور معیاری نثر کے ارتقا میں تو یہ صنف سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے ذریعہ اردو نثر کو اسالیب کا تنوع، لہجہ کی دلکشی اور آہنگ کا لطف ملا۔ داستانوں نے اردو نثر کو وسعت، ہمہ گیری، موضوعات کی ندرت، تخیل کی بلند آفرینی، رومان کی لطافت اور اسالیب کی رنگارنگی بخشی۔ مختصر طور پر یہ کہئے کہ داستانوں کی بدولت اردو نثر کا ارتقائی عمل ظہور پذیر ہوا اور ادبی نثر کے سرمائے میں مختلف اسالیب کا اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے داستان کو ''ادب کی سب سے موہنی صنف'' قرار دے کر لکھا ہے کہ ''داستان نے اردو نثر کو رنگ، روپ، نکھار اور رچاؤ دیا ہے۔ اس نے بڑی سرعت سے نثر کو دل نشیں اور دل نواز بنایا۔ اس میں متعدد اسالیب کے تجربے کئے گئے۔ شاعری کے بعد یہ ادبیت کا سب سے بڑا مخزن قرار پائی۔ نثر میں کوئی صنف شاعری سے کندھا ملاتی ہے تو وہ صرف داستان ہے''

(''اردو کی نثری داستانیں'' انجمن ترقی اردو کراچی ص ۶۶۳)

اردو نثر کے ارتقا میں داستانوں کا مطالعہ اسلئے بھی اہم ہے کہ اس سے قبل مذہبی تصانیف میں ادبی نثر کے جو مختصر نمونے ملتے ہیں ان کی زبان میں لوچ اور شیرینی نہیں ہوتی، صرف سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے جس سے ایک طرح کے سپاٹ پن کا احساس ہوتا ہے۔ داستانوں میں جذبہ واحساس کی آمیزش سے لوچ اور شیرینی وگھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ داستانوں کی وجہ سے نثر کے موضوعات میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی ہے اور رفتہ رفتہ سلیس وعام فہم اور شستہ وشگفتہ اسلوب ابھرنا شروع ہوا ہے یہ داستانیں نثری اسالیب کو رنگارنگی، رومانیت تخیل کی بلندی اور تشبیہات کی ندرت سے مالا مال کرتی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ ان داستانوں کی وجہ سے قصہ گوئی کا فن بہت بلند ہوا ہے۔

اس سلسلے میں ''سب رس'' سب سے پہلی اور اہم داستان ہے جسے ملا وجہی نے محمد یحییٰ ابیک فتاحی نیشاپوری کی تصنیف ''دستور العشاق'' کے نثری خلاصہ ''قصہ حسن ودل'' سے اخذ کیا اور قصہ کو تمثیل کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اس میں قصہ پر اگرچہ زیادہ دھیان نہیں دیا گیا مگر اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تاریخی اعتبار سے نثر کی جو مذہبی کتابیں اس سے قبل لکھی گئی تھیں ان کا مقصد عوام تک اپنی بات پہنچانا تھا، تحریر کی دلکشی اور اسلوب کے بانکپن سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وجہی نے فارسی اسلوب سے فائدہ اٹھا کر پہلی

بار ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی جو بقول سید عبد اللہ ایک معیاری اسلوب ہے۔ وجہی اس اسلوب کو ہندی زبان کے ساتھ اس طرح ملاتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وجہی نے اس کتاب سے اردو نثر میں ایک ادبی روایت قائم کی ہے اور نثر کو تمثیلی قصہ کی ایک نئی صنف سے روشناس کرایا ہے۔ اس میں پیش تصوف کے رموز ونکات کو رومانی داستان کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور حسن، دل، غمزہ، نظر، لٹ جیسے دلکش مگر غیر مجسم کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ متصوفانہ لہجہ اور عربی فارسی الفاظ کی بہتات کے باوجود داستانی رنگ کی شوخی وشیرینی میں کہیں کمی نہیں آئی۔ اس نثر میں داستانوی رومانیت کے عناصر بھی ہیں اور منظر کشی وکردار نگاری بھی۔ اس کے تمام کردارون میں زندگی کی حرارت اور توانائی موجود ہے۔ رشک وحسد اور ہجر ووصال کے واقعات اور عشق ومحبت کی مثالیں اس روانی وخوبی سے پیش کی گئی ہیں کہ اسلوب میں چاشنی اور داستان میں رومانیت ودلکشی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ قصہ اور اسلوب کی ندرت نے ہی اسے اردو نثر کا شاہکار بنا دیا ہے۔

دوسری اہم داستان ''قصہ مہر افروز دلبر'' ہے جسے ڈاکٹر گیان چند جین شمالی ہند کی ''سب سے قدیم داستان'' قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک ہلکا پھلکا قصہ ہے جسکی ضخامت ۳۷۶ر صفحات ہے۔ اس کے مصنف کا نام عیسوی خاں بہادر ہے جو غالباً دہلی کے رہنے والے تھے۔ قصہ کی ابتدا عام داستانوں کی طرح کی گئی ہے وہی بادشاہ کا لاولد ہونا، فقیروں کی دعا سے مراد بر آنا اور پھر شہزادے کا شکار کو جانا، مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹنا اور آخر میں کامیاب ہونا۔ لیکن قصہ کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ ایسی سادہ وشستہ نثر پہلی بار سامنے آتی ہے جو عام فہم ہے اور روزمرہ کی بول چال میں استعمال ہوتی ہے۔ داستان میں فارسی روایت سے ہٹ کر اردو کا اپنا اسلوب جھلکتا ہے۔ قصے کی زبان اور انداز بیان میں کہیں کہیں خامیاں بھی ہیں لیکن عیسوی خان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس عہد میں ایسی سادہ اور بامحاورہ زبان میں لکھا اور ادبی حیثیت برقرار رکھی۔ اس قصہ میں بہت سے قدیم الفاظ مثلاً آوتی، گاوتی، ناچتی، نابو، کدھی وغیرہ کا کثرت سے استعمال ہوا ہے زبان کے اس ہیولے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ داستان زبان دہلوی کا پہلا ادبی نقش ہے۔

اردو قصے کی تاریخ میں دوسری اہم کڑی ''نوطرز مرصع'' (۱۷۷۴) ہے اس کے مصنف میر عطا حسین خاں تحسین ہیں جو فارسی کے بھی ایک اچھے شاعر، نثار اور خوش نویس تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو میں کئی اور کتابیں بھی لکھیں مگر شہرت دوام ''نوطرز مرصع'' کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ اسکا قصہ فارسی داستان ''قصہ چہار درویش'' سے ماخوذ ہے۔ نوطرز مرصع کا اسلوب مقفی رنگین اور مشکل ہے۔ فارسی عربی الفاظ سے پُر ہونے کے علاوہ صنائع کا استعمال اس قدر ہوا ہے کہ عام بول چال کی زبان جاننے والا اسے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس کی زبان رنگین اور طرز ادا پرتکلف ومصنوعی ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ اول نوطرز مرصع جس زمانے میں لکھی گئی اس وقت زبان وبیان کا معیار فارسی انشا پردازی کے تتبع میں یہی تھا کہ عبارت میں تکلف وتصنع بہت ہو، سیدھی سادی بات بھی تشبیہ واستعارہ کی مدد سے کہی جاتی تھی۔ رعایت لفظی اور صنائع لفظی ومعنوی کا التزام خاص

طور پر رکھا جاتا تھا تحسین فارسی کے انشا پرداز تھے اور اسی ماحول کے پروردہ تھے اس لئے انہوں نے اپنی عبارت نویسی میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا۔ دوم یہ کہ داستان نواب شجاع الدولہ کی فرمائش پر ان کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے لکھی جارہی تھی ناممکن تھا کہ اس تحریر میں وہ اپنی انشا پردازی کے جوہر نہ دکھاتے لکھنؤ کی پوری تہذیب مرصع سازی کی تہذیب تھی اس لئے اس زمانے میں یہ اتنی قبول ہوئی کہ بہت سے لکھنے والوں نے اس کی تقلید کی۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں نثری قصوں کی ایک اہم کڑی مہر چند کھتری کی داستان ''نوآئین ہندی'' (۱۷۹۶ء) بھی ہے۔اس کا ماخذ فارسی کا قصہ ''آذرشاہ اور سمن رخ'' ہے۔ اس داستان میں نوطرز مرصع کے اس اسلوب کی توسیع ملتی ہے جسے سادہ عام فہم اسلوب کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔اس کی نثر ہر طرح کے تکلفات اور صنائع سے پاک اور روزمرہ کی بول چال کے عین مطابق ہے۔اسی زمانے میں ایک اور اہم داستان شاہ عالم ثانی نے ''عجائب القصص'' کے نام سے لکھی ڈاکٹر گیان چند جین نے اس کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے اسے چوتھا نمبر دیا ہے۔ اس داستان کا قصہ بھی وہی عام داستانوں جیسا ہے اور پلاٹ میں دیگر داستانون کے تمام عناصر ترکیبی موجود ہیں۔قصہ کے لحاظ سے تو اس میں کوئی انوکھا پن نہیں جو اس کو دوسری داستانوں سے اہم بنا سکے البتہ اسلوب بیان کے لحاظ سے اس داستان میں زبان کے بہت سے ارتقائی نمونے ملتے ہیں۔اس میں نوآئین ہندی کی نثری روایت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی ایسا اسلوب ابھرتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات میں اور اس میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔اس کا اسلوب عوام اور خواص دونوں کے لئے ہے۔ ساخت، تراکیب اور طرز استعمال کے لحاظ سے اس میں فارسیت کہیں نہیں۔ اردو پن اس کے اسلوب کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔واضح رہے کہ یہ قلعۂ معلیٰ کی پہلی تصنیف ہے جس میں قلعہ کی نکھری، شائستہ، سلیس اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ اردو قصہ اسلوب کے اعتبار سے ارتقا کر رہا تھا اور بہت جلد وہ رنگ اختیار کرنے والا تھا جس میں نئی اصناف نثری کی پیدائش بآسانی ہوسکے۔ اس عہد کی ایک اور داستان ''جذب عشق'' سید شاہ حسین حقیقت کے نام سے منسوب ہے۔گیان چند جین کے مطابق اس کا سن تصنیف ۱۲۱۱ھ یعنی ۱۷۹۸ء ہے۔تاریخی اعتبار سے اگرچہ یہ سب سے بعد کی تصنیف ہے مگر اس کی نثر نوآئین ہندی اور عجائب القصص سے بہتر نہیں۔ شعر اور نثر کو گھلا ملا کر دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے قبل لکھی گئی مذکورہ بالا داستانوں کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں قصہ گوئی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ انسان نے جب قوت گویائی سے کام لینا شروع کیا اسی وقت سے داستان اور انسان کا باہمی تعلق قائم ہوگیا تھا۔اردو میں اس کی ابتداء کافی تاخیر سے ہوئی مگر بہت جلد اس نے ایک باقاعدہ فن اور ایک صنف ادب کی حیثیت اختیار کرلی۔اس صنف کو تیزی سے فروغ دینے میں سادہ اور سلیس اسلوب بیان نے سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔ اگر نثر میں سادگی اور سلاست کی طرف توجہ نہ دی جاتی تو یقیناً اردو داستانوں کا وہی حال ہوتا جو ''معراج العاشقین'' سے

''شمائل الاتقیاء'' تک کی مذہبی تصانیف کا ہو یعنی ان کی اہمیت صرف اور صرف تاریخی ہوتی۔ نثر میں سادگی اور سلاست کے ذریعہ ان داستانوں کو ادبی اہمیت بھی حاصل ہوئی اور ان کے ذریعہ ہی قصہ گوئی کی جدید اصناف کو جنم لینے کا حوصلہ ملا۔ ان داستانوں پہ اگر چہ فارسی اسلوب کا گہرا اثر تھا اور نوطرز مرصع کے بہت سے حصے فارسی انشا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں مگر جس تیزی سے یہ رنگ اترنا شروع ہوا اور عجائب القصص تک آتے آتے نثر میں جتنی تیزی سے دلکشی، نکھار اور سادگی پیدا ہوتی گئی اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عوام وخواص کا رجحان سادہ اور سلیس اسلوب کی ہی طرف تھا۔ اگر عوامی مقبولیت اور تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ اسلوب کسی قیمت پر بار بار دہرایا نہ جاتا۔ اس اسلوب نے نثر میں بیان کی قوت، تازگی، سلاست اور شگفتگی جیسے عناصر داخل کیے جن کی مدد سے وہ ادبی نثر پیدا ہوئی جس کا سلسلہ آگے چل کر ''باغ و بہار'' ''امراؤ جان ادا'' ''گئودان'' اور ''شکست'' کی لازوال نثر سے ملتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) مین جان گلکرسٹ کی کوششوں سے جو تصانیف منظر عام پر آئیں ان میں صرف میر امّن دہلوی کی تصنیف ''باغ و بہار'' (۱۸۰۱ء) کو ہی شہرت دوام حاصل ہوئی۔ باغ و بہار کی اس غیر معمولی مقبولیت اور لازوال شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا اسلوب بیان اردو کی تمام داستانوں سے زیادہ دلکش اور دلنشیں ہے۔ اس کی نثر میں بڑی تازگی، توانائی اور دلکشی ہے جسے کتاب کے کسی خاص حصے میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ اول سے آخر تک فصیح وسلیس ہے عبارت میں ایسی روانی اور جاذبیت ہے کہ پڑھنے والا قصے کی دلچسپی سے قطع نظر خود اس کی روانی میں ایک گم گشتگی سی محسوس کرتا ہے۔ میر امن حقیقتاً بڑے فنکار ہیں ان کے قلم میں ماہر قلم کی سی چابک دستی ہے اور زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنا اور جزئیات پر توجہ دینے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ وہ واقعات سے آہستہ آہستہ پردہ اٹھاتے ہیں اور غیر محسوس طور پر فطری سچائیوں او تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ہندوستانی عوامی زبان ہے جس پر دہلی کے روزمرہ کی چھاپ ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں طوطا کہانی، آرائش محفل، داستان امیر حمزہ بیتال پچیسی، بحر عشق، قصہ دل آرام و دل رُبا، حسن وعشق، سنگھاسن بتیی، چار گلشن، شکنتلا ناٹک، مادھونل اور کام کنڈلا، نثر بے نظیر، مذہب عشق، قصہ گل وصنوبر، گلزار دانش، بہار عشق، قصہ فیروز شاہ وغیرہ بھی تصنیف یا ترجمہ کی گئیں جنہیں باغ و بہار جیسی شہرت تو نہیں حاصل ہوئی مگر ان کے مطالعہ سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ فورٹ کالج کی تصنیفات کے ذریعہ اردو نثر اور اردو اسلوب کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ اردو نثر پر سے فارسیت کی اجارہ داری ختم ہوئی اور اس میں کئی دوسری زبانوں کے اثرات شامل ہوئے مثلاً برج بھاشا کی لطافت بھی شامل ہوئی اردو ہندی اسلوب کی بے ساختگی و بے تکلفی بھی شامل ہوئی، عربی فارسی کی شیرینی وعظمت سے مل کر ان زبانوں نے اردو کو ایک نیا اسلوب دیا جس میں سادگی رنگینی سے، رومانیت حقیقت پسندی سے اور تخیل پرستی زندگی کی حقیقتوں سے متصادم نظر آتی ہے۔ اور یہ تصادم بیان میں کشش، دل آویزی، لطافت، اثر آفرینی اور معصوم تقدس پیدا کرتا ہے۔

اس اسلوب میں صرف سلاست اور سادگی ہی نہیں تشبیہات واستعارات کا نادر استعمال بھی ہوا ہے۔ قافیہ پیائی بھی کی گئی ہے اور فارسی جملے اور فقرے بھی چسپاں کئے گئے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر اس اسلوب میں وہ قوت پیدا ہوگئی ہے جو داستان یا قصے کے ارتقا کے لئے بہت ضروری تھی یعنی جذبات نگاری کا کمال، واقعہ نگاری کا وصف اور منظر نگاری کی صلاحیتیں بھی اس اسلوب میں موجود ہیں جو آنے والے دنوں میں ناول اور افسانہ جیسی اصناف کیلئے بنیادی ضرورتیں تھیں۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں انیسویں صدی کا زمانہ داستانوں اور قصوں کیلئے بڑا زرخیز رہا ہے۔ اس صدی کے وسط تک فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی بے شمار قصے تصنیف و ترجمہ ہوئے جن میں کچھ نے تو بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی اور کچھ کو وقت کی گردنے دبا دیا۔ ان داستانوں میں اسلوب کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق یا تضاد نہیں مگر کچھ بات ضرور ہے جس کی وجہ سے ادبی نثر اور قصہ گوئی کے فن کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ کالج سے باہر کے داستانوں میں اولیت انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' کو دی جاتی ہے۔ یہ انشا کا سب سے مشہور کارنامہ ہے جو زبان وبیان کے اعتبار سے اس عہد کی تمام داستانوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں انشا نے ہندی کے علاوہ کسی دوسری زبان کے الفاظ استعمال نہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس میں قصہ در قصہ کی داستانی روایت کی تقلید نہیں کی گئی ہے یہ ایک سیدھا سادا قصہ ہے جو لگ بھگ پچاس صفحات میں مکمل ہوگیا ہے۔ قصہ لکھنے کا سبب نہ تو کسی حاکم وقت کی فرمائش ہے اور نہ کسی دوست کی خاطر داری کرنا۔ اس کا اصل مقصد دوسروں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہے۔ چنانچہ انشا نے یہ طے کیا ہے کہ ایسی کہانی لکھی جائے جو دوسری زبانوں کے الفاظ سے مبرا ہو۔ اس طرح اس مقبول عام داستان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر کا ایک نیا اسلوب انیسویں صدی کے شمالی ہند میں فورٹ ولیم کالج سے باہر اگر کسی داستان میں ملتا ہے تو وہ ''رانی کیتکی کی کہانی'' ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے باہر لکھی گئی داستانوں میں مرصع و مسجع اسلوب سے مزین داستان ''فسانۂ عجائب'' کو بھی بہت زیادہ قبول عام حاصل ہوا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی یہ کتاب طرز واسلوب اور زبان کے اعتبار سے لکھنؤ کی نمائندگی کرتی ہے اور اردو کی لسانی تاریخ کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے ہر امکانی قسم کی لفظی و معنوی ترصیع کو زیب قرطاس کرنے کی کوشش کی اور زندگی کے ہر شعبے کی طرح اپنی تحریر میں بھی نفاست تکلف نزاکت اور تصنع کا کھل کر اظہار کیا۔ ان کے پاس اس اسلوب کو اپنانے کی دو وجہیں تھیں اول یہ کہ پورا معاشرہ ہی شعر وسخن اور زبان وادب کے میدان میں کمال رکھتا تھا ایسے میں سرور کیلئے ضروری تھا کہ وہ زبان وبیان کا وہ نادر نمونہ پیش کریں جسے دیکھ کر اپنے وقت کے ارباب فن بھی متحیر رہ جائیں دوسری وجہ سرور کی کلاسیکیت نوازی ہے۔ ان کو کسی طرح کی جدت سے سروکار نہیں۔ وہ ہر نئی بات کو چاہے کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو تجدید پسندی سمجھ کر نہ صرف ٹال دیتے ہیں بلکہ اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میر امن کے طرز کا مذاق اڑایا ہے۔ مگر اس میں دو رائے نہیں کہ سرور کو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔ شعر و شاعری میں ناسخ اور نثر نویسی میں سرور زبان کے امام مانے گئے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے باہر رانی کیتکی اور فسانۂ عجائب کے علاوہ بھی بہت ساری داستانیں لکھی گئیں (خود سرور نے کئی

داستانیں لکھیں) مگر اسلوب او ر دلچسپی کے اعتبار سے رانی کیتکی اور فسانۂ عجائب کے سوا کسی کو مقبولیت نصیب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر داستانوں میں وہی فارسی زدہ اسلوب ملتا ہے جو نوطرز مرصع اور فسانۂ عجائب میں موجود ہے یا کسی کسی داستان میں سادہ اور مرصع اسالیب کا امتزاج ملتا ہے جن سے نثر کے دونوں رجحانات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ قصہ کے اعتبار سے ان میں تراجم کے علاوہ طبع زاد داستانیں بھی ہیں جو اردو میں قصہ گوئی کے فن کی طرف سنجیدہ توجہ کا اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً گلشن نوبہار، قصہ رنگین گفتار، قصہ نورتن' جامع الحکایات، داغ عشق، دبستان حکمت، قصہ گل وصنوبر، فسانۂ اعجاز، باغ ارم، قصہ بہرام گور، حکایت سخن سنج، قصہ اگر وگل، الف لیلہ، بہارِ عشق، شرارِ عشق، شگوفہ محبت، شبستان سرور، حدائق انظار وغیرہ۔ مختلف اسالیب کی لطیف آمیزش، نئی اور طبع زاد کہانی، ہم عصر تہذیب کی مرقع کشی اور جذبات و احساسات کی موثر عکاسی نے ان میں سے چند داستانوں کو تاریخ میں اہم مقام کا حامل بھی بنایا ہے۔ ان داستانوں میں قصہ گوئی کا ایک خاص رجحان اور مزاج ملتا ہے جو مشکل پسندی سے بتدریج سادگی وسلاست کی طرف مائل ہے اور یہ سادگی وسلاست نتیجہ ہے زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج و حالات اور قدیم وجدید روایات واقدار کے مابین کشمکش کا۔ کیوں کہ نئے علوم وفنون کے اثرات صرف فنی اور ادبی ہی نہیں تھے بلکہ ذہن وفکر کو بھی متاثر کر رہے تھے چنانچہ سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں کی آمیزش سے جہاں مشرق ومغرب کے درمیان تہذیبی وتمدنی روابط مضبوط ہوئے وہیں زبان وادب خاص کر اردو قصہ گوئی بھی متاثر اور مستفید ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جو داستانیں تصنیف وترجمہ ہوئیں وہ باوجود داستان کی فطری رومانیت اور عینیت کے حقیقت پسندی کی صلاحیت اور سادگی ودل آویزی کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔ ان داستانوں سے ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں ہماری معاشرت اور تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں ہمارے تمدن کی روایات اور اقدار محفوظ ہوگئی ہیں۔ داستان گویوں کی نگاہیں نئی گزرگاہوں کی متلاشی نظر آتی ہیں۔ خواب وخیال اور تصور کی رنگین دنیا سے نکل کر لوگ حقیقت کی کھوج میں سرگرداں ہو گئے تھے۔ چنانچہ 'فسانۂ عجائب'' میں طرز بیان کو نظر انداز کر دیا جائے تو ماحول کی منظر کشی، معاشرت کی مرقع نگاری اور لکھنوی تہذیب کی سچی تصویریں اس فکر کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو آہستہ آہستہ قصوں میں حقیقت پسندی کو فروغ دے رہی تھی۔ اسی طرح ''رانی کیتکی کی کہانی'' بھی خالص ہندوستانی ہے اور زبان کی قیدوبند کے باوجود اس میں معاشرت وسیرت کے زندہ نمونے پائے جاتے ہیں بلکہ کسی بھی داستان کو اٹھالیا جائے یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس کا قصہ خلا میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ قصہ گو اسی دنیا کا ہے اور اس نے الفاظ اسی دنیا کے استعمال کئے ہیں اسلئے عمداً یا سہواً ہر تصنیف میں اس معاشرت کی تصویر کھنچ گئی ہے جس میں اس کا مصنف رہتا تھا۔ دہلوی داستان گو اپنی داستانیں دہلی دربار کے ماحول سے سجاتا ہے اور اسی معاشرت کا نمونہ پیش کرتا ہے جو قلعۂ معلّیٰ میں رائج تھی۔ لکھنؤ کا داستان گو جب سماں کھینچتا ہے تو قاری خود کو نوابین اودھ کے درمیان محسوس کرتا ہے۔

غرض ان قصہ گویوں نے اپنی ضخیم تصنیفات میں پلاٹ کو گتھنے اس کو پراسرار بنانے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے کیلئے حد

درجہ فنکارانہ جدت سے کام لیا ہے۔اسی لئے انہوں نے کردار نگاری پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اور ایسے سینکڑوں کردار پیش کئے ہیں جو ذہن سے چپک جاتے ہیں۔ایسے کردار دنیائے ادب میں زندۂ جاوید ہو گئے ہیں مثلاً امیر حمزہ، قیس، عمرو عیار، حاتم طائی ،میمون، راجہ بکرم بیتال، تاج الملوک، دل آرام اور مہر افروز وغیرہ مردوں میں اور عورتوں میں ملکہ مہر نگار، ملکہ حیرت، ملکہ بہار ،ملکہ مخمور، لیلیٰ، بدیع الجمال، دلربا، شگفتلا، دلبر جیسے کردار کسی طور پر فراموش نہیں کئے جاسکتے۔

گویا آج ناول کے عروج کے زمانے میں کہا جاسکتا ہے کہ ناول کے ارتقا کے لئے جو عناصر ضروری تھے ان میں چند کی پیدائش داستانوں کے ذریعہ ہو چکی تھی مثلاً زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر کشی ، فضا اور ماحول کی منظر نگاری ، جذبات وخیالات کی موثر عکاسی ، عمدہ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری وغیرہ۔ رہ گئی بات اسلوب بیان کی تو ہم دیکھتے ہیں کہ قصہ مہر افروز دلبر ہی سے اس پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے ۔ فورٹ ولیم کالج سے قبل شمالی ہند کی اردو داستانوں پر اگر چہ فارسی اسلوب کا اثر بہت گہرا تھا مگر رفتہ رفتہ فارسیت کا رنگ ہلکا ہوتا گیا اور عجائب القصص تک آتے آتے تو اس میں کافی نکھار، جاذبیت اور فصاحت پیدا ہو گئی۔فورٹ ولیم کالج میں اسلوب پر خاص زور دیا گیا تھا اس لئے یہاں کی داستانیں نثر قصہ گوئی کے ارتقا کے لئے بہت اہم ثابت ہوئیں۔دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے جانے کی وجہ سے ان داستانوں میں عربی ، فارسی ، برج وغیرہ کے الفاظ اردو میں تیزی کے ساتھ داخل ہوئے ۔ اردو نثر برج اور ہندی کی بے ساختگی اور عربی وفارسی کی شیرینی سے ہم آہنگ ہوئی اور واقعیت، رومانیت اور سلاست ورنگینی کا امتزاج بھی نمایاں ہوا۔ میر امنؔ، حیدریؔ اور افسوسؔ وغیرہ خاص طور سے ایسے مصنفین تھے جنہوں نے اردو قصہ گوئی کے اسلوب کو خاص طور سے آگے بڑھایا۔ان کے یہاں فنی پختگی اور استقلال ہے۔ان لوگوں نے ماضی کی روایت کی پاسداری بھی کی ہے اور حال کے تقاضوں کو بھی سمجھا ہے۔

کالج سے باہر قصہ گوئی کے فن کو جو ترقی نصیب ہوئی اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں بڑی تعداد میں طبع زاد داستانیں ملتی ہیں ۔ان داستانوں میں بھی اسلوب کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے ۔یہ اسلوب نہ صرف اپنے معاشرے اور مزاج کا عکاس ہے بلکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات ، قدیم وجدید اقدار کی کشمکش اور نئے علوم وفنون کے اثرات سے بھی متاثر ہوا ہے۔سنسکرت وہندی، عربی وفارسی اور ہندوستانی زبانوں کی آویزش سے ایک طرف مشرق ومغرب کے درمیان تہذیبی وتمدنی روابط مضبوط ہوئے تو دوسری طرف زبان وادب پر بھی گہرا اثر پڑا۔شاید اسی لئے کالج کے باہر کی داستانیں دو مختلف اسالیب کی طرف گامزن ہیں یعنی سادگی وسچائی اور روانی کے ساتھ رنگینی وقافیہ پیمائی بھی ملتی ہے۔لیکن زیادہ تر داستانوں کا غالب رجحان یہی بتاتا ہے کہ اس دور کے قصوں میں داستان کی فطری رومانیت، طلسماتی ماحول اور عبارت آرائی کے باوصف حقیقت نگاری، سادگی اور اظہار بیان کی توانائی موجود ہے اور عربی وفارسی کا اثر بتدریج کم ہوا ہے ۔ اردو نثر میں مدلل بیانیہ اور وضاحتی اسلوب نمودار ہو گیا ہے۔اب اس کی راہیں کشادہ اور روشن نظر آنے لگی ہیں۔ لوگ خواب وخیال کی رنگین دنیا سے نکل کر حقیقت کی اس راہ پر چل پڑے ہیں جو فن قصہ گوئی کو ناول اور افسانہ تک پہنچاتی ہے۔ ☆☆☆

ڈاکٹر تابش مہدی

پریم چند کی تخلیقی عظمت

ہر تخلیق کار خواہ وہ نثر نگار ہو خواہ شاعر، اس کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ وہ اپنی اُسی دنیا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول یا فکری سطح کا ہوتا ہے، اس کا فن پارہ اس کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ ہمارے گردوپیش کی وہ دنیا جس سے ہم اور آپ بے نیازانہ گزر جاتے ہیں، اُدھر مڑ کر دیکھتے بھی نہیں، اِس لئے کہ اُس میں ہمارے لئے کوئی رنگ و کیف نہیں ہوتا، ایک شاعر و فن کار کیلئے اس کی حیثیت ایک اتھاہ سمندر کی ہوتی ہے۔ وہ اُس میں ڈوب کر انمول لعل و جواہر تلاش کرتا ہے اور کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ پھر اُنہیں کو اپنے اعلیٰ تخلیقی شعور سے عالمی و آفاقی حسن عطا کر دیتا ہے۔

جب ہم شاعری میں میرؔ، مصحفیؔ، مومنؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو یا کہانی اور افسانے کی صنف میں عبدالحلیم شررؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، سجاد حسین، نذیر احمد اور ابن فریدؔ کو پڑھتے ہیں تو اس نقطہ نظر کی تصویب ہوتی ہے۔

مجھے بعض ناقدین کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ شعر و سخن کی دنیا میں جو مقبولیت، محبوبیت اور ہر دل عزیزی صنفِ غزل کو حاصل ہے، وہی مقبولیت، محبوبیت اور ہر دل عزیزی نثری ادب میں افسانے یا کہانی کو بھی حاصل ہے۔ ایک غزل گو کو محض ایک شعر میں اپنی بڑی سے بڑی بات کو سمونا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ شعر بس دو چار الفاظ پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔

ایک افسانہ نگار یا کہانی کار کی بھی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں پوری داستان بیان کر دے۔ جس داستان یا قصے کو بیان کرنے کیلئے صحافی یا دوسرے اہل قلم حضرات ایک دفتر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اسے ایک افسانہ نگار محض چند سطور میں مکمل کر دیتا ہے۔ میرے نزدیک افسانے یا کہانی کو غزل جیسی مقبولیت و محبوبیت عطا کرنے والوں میں سب سے اہم اور ممتاز نام منشی پریم چند (۱۸۸۰-۱۹۳۶) کا ہے۔ پریم چند نے افسانے یا کہانی کو ایسا رنگ روپ عطا کیا کہ یہ صنف سب کیلئے محبوب و پسندیدہ بن گئی۔

منشی پریم چند ہمارے اُن ادیبوں اور فکشن نگاروں میں ہیں، جن کی سوچ اور فکر کی دنیا ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ وہ سماج کے گرے پڑے، پچھڑے ہوئے اور نہایت ناقابلِ توجہ لوگوں کو اپنی کہانی کا موضوع بنا کر انہیں اپنے فن اور تخلیقی شعور سے زندۂ جاوید بنا دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں جن کرداروں کو اجاگر کیا ہے، وہ عام نگاہوں کیلئے بے حد معمولی، ارذل اور بے عیار ہونے کے باوجود محبت و اخوت، ایثار و ہم دردی اور اعلیٰ انسانی و اخلاقی قدروں کی بلندیوں پر ملتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بلندی تک پہنچنے کے لئے انہیں بڑے بڑے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں اور بے پناہ صعوبتوں، مشقتوں، مشکلات اور دشواریوں کے سمندر کو پار کرنا پڑتا ہے۔

منشی پریم چند کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر جھانک کر اس کی خامیوں، خرابیوں اور گندگیوں کو نہیں تلاش کرتے۔ وہ اس کے اندر اس مخفی جوہر کو دریافت کر کے اُسے اُجالنے اور نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے زندگی کی تیرہ و تاریک پگڈنڈیوں میں اخلاق و تہذیب، محبت و یگانگت، خوش حالی اور امن و سلامتی کی روشنی بکھر سکے۔ وہ ہمیشہ انسان کی سیرت کے روشن اور تاب ناک پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں اور انہیں کی مدد سے اپنی کہانی کا خاکہ تیار کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی بھی انسان کے خارجی یا داخلی معائب و محاسن یا خامیوں اور خوبیوں کو اس کے اپنے ماحول کا عطیہ خیال کرتے ہیں۔ کبھی اس کی غربت اس کے اندر دولت و ثروت کی طمع پیدا کر دیتی ہے، کبھی سماج کی طرف سے اس کے ساتھ ہونے والا ناقدریوں اور نابرابریوں کا رویہ اُسے شہرت و نام وری کا طالب بنا دیتا ہے اور کبھی اس کے خاندان کا مخصوص ماحول اُسے تہذیب و ثقافت اور سنجیدگی و شائستگی کی قدروں سے نا آشنا کر دیتا ہے۔ وہ خواہ کسی کہانی، افسانے یا ناول کے لئے خاکہ تیار کریں خواہ کسی دوسرے موضوع کیلئے وہ اپنے قلم کو کسی بھی بھید بھاؤ یا تفریق و تعصب سے بلند رکھتے تھے۔ یہی ایک اچھے، سچے اور حقیقی ادیب یا شاعر کی پہچان ہے۔

یہ بات مضمون کی ابتدائی سطور میں آچکی ہے کہ پریم چند کی تخلیقی دنیا میں محنت کشوں، مزدوروں، دیہاتیوں، کسانوں، غریبوں، مفلسوں اور سماج کے عزت و تکریم سے محروموں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے تمام افسانے یا ناول انھی کے گرد گھومتے ہیں۔

پریم چند نے گاؤں اور قریوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ گاؤں والوں کی ذہنیت، ان کی سوچ اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز کا ایک عمیق مشاہدہ ان کے ہاں ملتا ہے۔ ان کے افسانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہقانوں اور کسانوں کو وہ بڑی قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں اور ان کی سادگی اور بے آمیز روکھی پھیکی زندگی میں وہ غیر معمولی رنگ و رعنائی محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے سماج میں رہ کر سماج سے محبت کی ہے۔ اس کے زخموں کی بدبوؤں سے گھن کر کے انہوں نے منہ نہیں بسورا اور اس کی ٹھوکروں اور لغزشوں پر قہقہے نہیں لگائے، بلکہ اس کے مظلوم، دکھی اور ستم رسیدہ افراد کو انہوں نے سینے سے لگایا اور انہیں محبت و احترام سے ہم کنار کیا ہے۔

منشی پریم چند گرچہ کسان نہیں تھے، لیکن چوں کہ وہ دیہات میں پیدا ہوئے تھے، ان کا بچپن گاؤں کے مخصوص ماحول میں گذرا تھا، کھیتوں، کھلیانوں اور باغوں میں وہ کھیلے کودے تھے، کسان اور فطرت کے رشتوں کا انہوں نے گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا، اس لئے وہ زندگی کی حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کسان اور فطرت کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ انہوں نے اسی رشتے کو اور انسان کے جذبات و خیالات کو اپنے افسانوں، کہانیوں اور ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے اسی رویے نے انہیں ایک منفرد فکشن نگار کی حیثیت دے دی ہے۔ میری اس رائے کی تائید کے لئے پریم چند کے بے شمار افسانوں، کہانیوں اور درجنوں ناولوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس موقعے پر ان کے صرف دو افسانوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ایک کا عنوان 'پوس کی رات' ہے اور دوسرے کا 'سوا سیر گیہوں'۔

'پوس کی رات' منشی پریم چند کی ایک مشہور کہانی ہے۔ اس کہانی پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ پوس، فصلی سن کا وہ چوتھا مہینہ ہے، جو گاؤں اور دیہاتوں میں سردی کی شدت کیلئے خاص طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کہانی کا اصل کردار ایک کاشت کار ہرکھو ہے۔ اس کی بیوی منی بھی اس کے شانہ بہ شانہ ہے۔ ان دونوں کرداروں سے ایک افلاس زدہ خاندان کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے۔ لیکن ہرکھو کا کتا بھی اس کہانی کی بنیادوں میں شامل ہے، جسے ہرکھو جبرا، کے نام سے پکارتا ہے۔ کہانی اس طرح ہے:

ہرکھو ایک نہایت غریب اور مفلس کسان ہے۔ کھیت اتنا کم ہے کہ اس سے اتنی پیداوار نہیں ہوتی کہ اس کی زندگی کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ اس کی بیوی منی اس سے مسلسل کہتی رہتی ہے کہ وہ کسانی چھوڑ کر محنت مزدوری کرنے لگے۔ تاکہ سکون سے دووقت کی روٹی تو مل جائے۔ بچے پیٹ بھر کر کھانا تو کھا سکیں۔ لیکن ہرکھو محنت مزدوری پر کسانی کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ اس میں اپنی اور اپنے خاندان کی عزت سمجھتا ہے۔ پوس کا مہینہ آچکا تھا، سردی کڑاکے کی شروع ہو چکی تھی، انہوں نے جانے کہاں کہاں سے تین روپے اس لئے جمع کئے تھے کہ ایک کمبل خریدیں گے، تاکہ جاڑے کا مقابلہ کرسکیں۔ ابھی وہ کمبل خریدنے کے لئے جانے ہی والے تھے کہ زمین دار کا نمائندہ شہنا مال گزاری (لگان) وصول کرنے کے لئے آگیا۔ وہ وصولیابی کے سلسلے میں بڑا سخت رویہ اختیار کرتا تھا۔ کسان اس سے بے حد پریشان تھے۔ ہرکھو نے بیوی سے کہا کہ وہ جو تین روپے کمبل کیلئے رکھے ہوئے ہیں، وہ انھیں شہنا کو دے دے۔ بیوی کو اس میں تردد ہوا، کہا کہ وہ کمبل کے لئے اکھٹا کئے تھے، اگر اُسے دے دیں گے تو سردی کیسے کٹے گی۔ لیکن ہرکھو نے اس کی ایک نہ سنی، وہ روپے اسے دلا دیئے۔ اس لئے کہ اسے شہنا کا مزاج معلوم تھا۔ وہ گالی گلوچ نہیں سن سکتا تھا۔ کہا کہ سردی کسی طرح کاٹ لی جائے گی۔ اس وقت شہنا کی گالیوں سے تو ہم بچ جائیں گے۔

یہیں سے ہرکھو کے کتے جبرا کا کردار شروع ہوتا ہے۔ پریم چند نے جبرا کے کردار کو دکھاتے ہوئے لکھا ہے:

ہرکھو نے اپنے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا: کیوں جبرا جاڑا لگ رہا ہے؟ کہا تو تھا کہ پوال پر لیٹ رہ۔ یہاں میرے پاس کیا لینے آگیا؟ اب کھا سردی۔ میں کیا کروں؟۔ جبرا نے لیٹے ہوئے دم ہلائی اور ایک انگڑائی لے کر چپ ہو گیا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کوں کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آرہی ہے۔

جب یہ کہانی آگے بڑھتی اور قاری اس مقام پر پہنچتا ہے تو غربت وافلاس کی پوری تصویر کسی داغ دھبے کے بغیر سامنے آجاتی ہے:

جبرا نے اپنے گلے پنجے اُس کے گھٹنوں پر رکھ دیے اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ ہرکھو کو اس کی گرم سانس اچھی لگی۔ وہ چلم پی کر لیٹا اور طے کرلیا کہ چاہے جو بھی ہو جائے، اب سو جاؤں گا۔ لیکن ایک لمحہ میں سردی سے اس کا کلیجا کانپنے لگا۔ کبھی اس کروٹ لیٹتا، کبھی اُس کروٹ۔ جاڑا بھوت کی طرح چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔ جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر، اُسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آرہی تھی۔ مگر اُسے گود سے چمٹائے ہوئے اُسے ایسا سکھ معلوم ہو رہا تھا،

جو ادھر مہینوں سے اُسے نہیں ملا تھا۔

ہرکھو کی بیوی منی نے پھر اس سے کہا کہ میں پھر تم سے کہتی ہوں کہ کسانی کا کام چھوڑ کر مزدوری کرنے لگو۔ آخر کار اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اب کی بار میں کھیت کا لگان نہیں دوں گی۔ ہرکھو اپنی بیوی کے کرب کو سمجھتا ہے اور اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

منی! جی میں تو میرے بھی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں۔ مگر جب مزدوری کا خیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب میں مزدوری نہیں کروں گا۔ چاہے جتنی درگت ہو جائے۔

یہ دراصل کہانی کا کلائمکس ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں قاری یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے اپنی تہذیب وثقافت اور خاندانی رکھ رکھاؤ سے کتنا تعلق ہونا چاہئے۔ اس کہانی سے پریم چند کا وہ بنیادی مقصد سامنے آتا ہے، جسے ہم آزادی یا حریت کہتے ہیں۔ حصول آزادی پریم چند کا مشن تھا۔ پریم چند کے اسی رویے کو سامنے رکھ کر مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی لکھا تھا:

ہندوستان میں تحریکِ وطنیت کے آئندہ مورخ کو جس طرح گاندھی، نہرو، محمد علی اور ابوالکلام آزاد کی ایک ایک سطر کی چھان بین ناگزیر ہوگی، اسی طرح پریم چند کے بھی افسانوں کو الٹ پلٹ کئے بغیر کام نہ چلے گا۔ (انشائے ماجد،ص:۲۳۴)

پریم چند کی دوسری کہانی جس کا یہاں تذکرہ کرنا ہے وہ 'سوا سیر گیہوں' ہے۔ یہ کہانی پریم چند کے افسانوں کے مجموعے 'فردوسِ خیال' میں شامل ہے۔ یہ ایک نہایت عام فہم کہانی ہے۔ اس کا بنیادی کردار شنکر ہے۔ ایک سیدھا سادہ، غریب اور مفلوک الحال کسان ہے۔ وہ اپنی غربت اور تنگ دستی کے باوجود مہمان نوازی اور ہمدردی وغم گساری کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے۔ مذہبی اور دھارمک لوگوں سے اُسے خصوصی عقیدت ہے۔ کہانی یہ ہے کہ:

ایک دن شنکر کے گھر ایک سادھو مہاراج پہنچ گئے۔ شنکر کے پاس گھر میں کچھ نہیں تھا، اس کے باوجود وہ اپنے عظیم مہمان کی ضیافت کے لئے بے چین ہو گیا۔ چنانچہ وہ اپنے قریب کے ایک مذہبی شخص کے پاس پہنچا۔ اُن صاحب کو ایک بڑے طبقے میں پروہت کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اس پورے طبقے کے گرو تھے۔ شنکر بھی اُن کے بھگتوں میں شامل تھا۔ شنکر نے اپنے گرو کے ہاں سے سوا سیر گیہوں لاکر اپنے معزز مہمان کی ضیافت کی۔

اس نے اپنی سادگی کی وجہ سے گرو کے سوا سیر گیہوں یہ سوچ کر واپس نہیں کئے کہ یہ چھوٹی سی چیز کیا واپس کروں، چیت میں جب فصل کٹے گی اور حسب معمول گرو جی کو کھلیانی دینے لگوں گا تو اس میں سوا سیر کا اضافہ کردوں گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن گرو جی مزاجی طور پر مہاجن تھے۔ ان کا لین دین کا کام چلتا رہتا تھا۔ انہوں نے سات برس کے بعد سوا سیر گیہوں کا سود بیاج جوڑ کر کل تین من گیہوں کا مطالبہ کردیا۔ سوا سیر گیہوں کا سود تین من کی بات شنکر کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس کے لئے یہ بوجھ ناقابل برداشت تھا۔ پھر جوں جوں دن گزرتے گئے، اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ نتیجے میں شنکر اس بڑے قرض کے بدلے میں پروہت جی کا غلام ہو گیا اور جب شنکر غلامی کرتے کرتے مر گیا تو اس کی اولاد کو اپنے گلے میں غلامی کا یہ پٹا باندھنا پڑا۔

(بقیہ صفحہ ۹۲ پر)

اردو انشا پردازی کی مذہبی جڑیں

[فکشن کی تاریخ کے خصوصی حوالے سے]

صفدر امام قادری
صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ

آج انسانی سماج کو ادب، سیاست، مذہب اور معیشت کے درمیان توازن بٹھانے میں جس قدر بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی اہمیت اور ضرورت سے منکر ہو کر کرۂ ارض پر جینا شاید ہی ممکن ہو سکے۔ جدید اور ترقی یافتہ دنیا میں سیاست اور معیشت کے بے پایاں اور گوناگوں اثرات کو ماننے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن دنیا کے ایک بڑے حصے سے مذہب بے زاری کی آوازیں بہت واضح انداز میں سنائی دیتی ہیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ ادب کے حاشیئے تک پہنچ جانے کی بات ایک بڑا طبقہ ماننے لگا ہے۔ گذشتہ چار پانچ سو برس کی ترقیات نے مذہب کو پہلے دقیانوسیت اور بوسیدگی کا مترادف بتایا اور بعد میں انتشار اور انتہا پسندی کا نقیب بتانے کی مہم چھیڑی گئی۔ مادیت نے یوں بھی ادب کا بازار بھاؤ اتنا گھٹا دیا کہ اس کی سماجی حیثیت 'ہر چند کہ ہے' نہیں ہے' جیسی ہوگئی۔ ایسے میں سو برس پہلے اکبر کی خدا لگتی یاد آتی ہے:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ایسے ادب اور مذہب بے زار ماحول میں، اردو فکشن کے حوالے سے مجھے دونوں کے باہمی تعلق کی پڑتال کرتے ہوئے اردو انشا پردازی کی جڑوں کی تلاش کرنے کی ضرورت آن پڑی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کے ایک طالب علم ہونے کی وجہ سے مجھے سرسری گزرنے کے بجائے اصولی گفتگو کے ساتھ ساتھ فکشن کے اہم نمونوں کی زبان اور اسلوب کا مقدور بھر احتساب کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

ملا وجہی کی تصنیف 'سب رس' کو اردو کی ادبی نثر کا اولین نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے جسے ۱۰۴۵ھ بمطابق ۳۵-۱۶۳۴ء لکھا گیا تھا۔ اردو ادب کے مورخین 'پہلی غیر مذہبی داستان' کے بطور 'سب رس' کی شناخت کرتے ہیں۔ اس سے پہلے برہان الدین جانمؔ کی کلمۃ الحقائق' کو مذہبی مقصد سے لکھی ہوئی کتاب قرار دے کر ادبی تاریخ سے درکنار کرنے کا اردو میں رواج عام ہے۔ 'سب رس' کے مصنف نے جس نثر یا انشا کا خاکہ تیار کیا، اس کا اصول یہ تھا:

''آج لگن کوئی اس جہاں میں، ہندوستان میں، ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہو نثر ملا کر گلا کر یوں نیں بولیا۔''

ملا وجہی نے نثر اور نظم ملا کر جس نئی نثر نویسی اور قصہ گوئی کا خاکہ قائم کیا وہ اردو میں قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی ادب کے لئے مرجع روایت کا آخری اصول بن گیا۔ سادہ گوئی کے پرستاروں نے بھی اپنی سادگی میں پرکاری کے جلوے سمونے کے لئے وجہی کے اصول نثر نگاری سے ہی روشنی

حاصل کی۔ لیکن یہ تفتیش بیحد دل چسپ ہوگی کہ آخر وجہی کے اسلوب کے ایسے جوہر کیوں کر کھلے اور اس انشا کی بنیاد میں کون سی زبان اور کیسا نفس مضمون شامل ہے؟

’سب رس‘ میں قافیہ بندی کے ساتھ ساتھ پیکر تراشی، تشبیہات واستعارات کو نثری ستون کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی یہ جملے مصرعوں کے مانند ’سب رس‘ کے صفحات پر تیرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر وبیشتر جملے طول طویل ہیں لیکن الفاظ وتراکیب کے استعمال میں ایسی مشاقی اور مہارت ہے کہ یہ پڑھنے یا سننے میں شاعرانہ لطف تو دے سکتے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے کسی ابہام کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ یوں تو نقادوں نے ’سب رس‘ کو مرصع اور مسجع نثر کے نمونے تک محدود کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کتاب کے متن پر ہماری نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ساتھ کئی کتابوں کا لطف اور ذائقہ میسر آرہا ہے۔ قصہ ’حسن ودل‘ کے ترجمے کی وجہ سے اگر اس کا ایک رخ تمثیلی ہے تو اسی کے ساتھ قصہ در قصہ کی تکنیک اپنانے کی وجہ سے قصے کی اٹھان ایک مکمل داستانی فضا وضع کرتی ہے۔

لیکن ’سب رس‘ کے مطالعے کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ وجہی کے نام سے قبل جس احترامی لقب ’ملا‘ کو ہم اس کے اصل نام کی طرح آج جو یاد کرتے ہیں، آخر اس کی صلاحیت کے استعمال اور خون جگر کے صرف کرنے کا موقع ابھی کہاں آیا۔ دکن میں ’ملا‘ جن کے نام کے ساتھ جڑا، وہ واقعتاً مذہبی علوم کے ماہرین میں سے آتے تھے۔ ملا وجہی بھی خاصا عالم فاضل آدمی تھا۔ وہ قصہ ’حسن ودل‘ ترجمہ کر کے اور ایک قصہ گو کی طرح داستان سرائی کر کے کیوں صبر کر لیتا۔ اسی لئے ’سب رس‘ میں اُس نے اپنے مطالعے اور تجربے کا نچوڑ شامل کرنے کے لئے مختصر انشائی شذرات کہیں پیوند اور کہیں جز و قصہ کی طرح شامل کر دیا ہے۔ ایمان کی بات تو یہی ہے کہ انہیں شذرات میں ’سب رس‘ کی روح موجود ہے اور یہیں ملا وجہی کی انشا پردازی نصف النہار پر ہے۔

> .....گزشتہ چار پانچ سو برس کی ترقیات نے مذہب کو پہلے دقیانوسیت اور بوسیدگی کا مترادف بتایا اور بعد میں انتشار اور انتہا پسندی کا نقیب بتانے کی مہم چھیڑی گئی۔ مادیت نے یوں بھی ادب کا بازار بھاؤ اتنا گھٹا دیا کہ اس کی سماجی حیثیت ’ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے‘ جیسی ہوگی.....

’سب رس‘ کو اردو کی پہلی ادبی نثر کہتے ہیں لیکن زبان وانشا اور نفس مضمون کی سطح پر اس میں جو پختگی نظر آتی ہے، اس کی پشت پر اس کا مذہبی علم ہے۔ شذرات میں اخلاق، تصوف و معرفت کی جو نہایت گہری باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں، اگر ان میں اپنے عمیق مذہبی مطالعے کا نچوڑ وجہی نے پیوست نہیں کیا ہوتا تو شاید ’سب رس‘ دکن کی ایک عام سی کتاب بن کر رہ گئی ہوتی اسی علم کی بہ دولت اس میں جہاں دیدنی بھی آئی ہے۔ وہ اپنے تجربات او رمشاہدات کو اپنے عہد کا ترجمان بنا کر پیش کرنے میں صرف اس لئے کامیاب ہوسکا کیوں کہ اس نے اپنے قصے میں مذہبی علم کی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ملا وجہی کو معلوم ہے کہ وہ صرف ایک عالم نہیں بلکہ ایک ماہر قصہ گو اور شعر وادب کے کوچے کا سیاح بھی ہے، اسی لئے مذہب اور کار دنیا کو حلول کر کے اپنے انشائی کرتب سے ایک ایسا ادبی صحیفہ تیار کرتا ہے جہاں قدم قدم

پر رسائل صوفیہ کا گمان بھی گزرتا ہے لیکن اگلے قدم پر ہی وجہی کا کوئی دوسرا رنگ ہمیں دعوت نظارہ دینے لگتا ہے۔ جہاں بادشاہ بھی ہے، عورت اور شراب بھی لیکن کوئی ایسا مقام نہیں جہاں ملا وجہی کی انشاپردازی کی آنچ کم ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی پختگی میں کوئی کمی آتی ہے۔

'ملا وجہی کی انشاپردازی میں پختگی کی بنیاد اس کی قصہ گوئی سے زیادہ عالم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی درس میں وہ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی بولیوں کے آداب بھی سیکھتا ہے۔'' اردو کی پہلی داستان میں اسلوبیاتی سطح پر ایک تکمیلیت کا احساس ہوتا ہے جہاں سے آنے والے وقت کی زبان جنم لینے والی ہوتی ہے 'سب رس' ٹکسال ثابت ہوئی اور اردو داستان کا ہر موڑ اپنے انشائی رنگ وروغن کے لئے ملا وجہی سے ہی سند لیتا رہا۔ اس سے یہ سلسلہ بھی قائم ہوا کہ ہر داستان گو ملا وجہی کی ہی طرح اپنے مذہبی علم اور تجربوں کو قصوں کی ترتیب میں داخل دفتر کر کے ایک دلچسپ صورت حال پیدا کرتا رہا۔ 'نوطرز مرصع'' عجائب القصص' 'باغ و بہار' 'طلسم ہوش ربا' 'فسانہ عجائب' جیسی داستانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اگر ایک عالم ان کے انشا پردازانہ جوہر پر سر دھنتا ہے تو کیا اس داد و تحسین کی بنیادیں صرف قصہ گوئی میں پیوست ہیں یا ان کے بعض دوسرے پہلو بھی قابل غور ہیں؟ میری سفارش ہوگی کہ مذکورہ داستانون کا مطالعۂ تو ہمیں یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ ان داستانون میں تاریخ اسلام یا مذہبی امور کی بحث نے جو اہتمام اور پرتکلف صورت حال قائم کی ہے، اسی سے ان مصنفین کی انشاپردازی کا رنگ مزید نکھرا اور زبان واسلوب کی شوکت میں اضافہ ہوا۔ اگر ان داستان گویوں نے اپنے بنیادی قصوں میں اسلامی ماحول کی شمولیت کی گنجائش نہیں پیدا کی ہوتی تو ان کے اسلوب بیان کی قسمیں سیکڑوں برس تک کیسے کھائی جا سکتی تھیں؟

یہ سوال قابل غور ہے کہ انشاپردازی کے عناصر ترکیبی کیا کیا ہیں اور یہ بھی کہ تخلیقی اور غیر تخلیقی نثر میں اس کی صورت کس حد تک بدل سکتی ہے؟ غالبؔ نے کہا تھا:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسی طرح انشا پرداز کے لئے 'بادہ و ساغر' کی کون سی صورت ہو سکتی ہے؟ اردو نثر کے طالب علم کی حیثیت سے متعدد انشاپردازوں کے شہہ پاروں کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو کی تخلیقی یا غیر تخلیقی نثر بالعموم انہی مرحلوں میں انشا پردازانہ سلوک کے ساتھ دکھائی دیتی ہے جب اُسے اسلامی تاریخ یا مذہبی علم کے کاندھے پر سوار رکھا جائے۔ عربی اور فارسی زبان کے اہتمامات اس پر مزید روشنی اور چمک بڑھاتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ باتیں داستانوں یا قصہ گوئی کے خصوصی تناظر میں ہو رہی ہیں، اور لکھنے والے کو معلوم ہے کہ وہ مذہبی کتاب نہیں لکھ رہا ہے بلکہ اسے تو ایک ادبی شہہ پارہ پیش کرنا ہے اسی لئے 'سب رس' تک محدود نہیں، مذکورہ تمام داستان گویوں نے اسلوبیائی سطح پر مذہب سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اپنے عمومی مضمون کو بدل دینے کی کوشش نہیں کی۔ اسی لئے داستانوں کی ادبی صحیفہ کے بطور آزادانہ شناخت قائم ہے۔

داستانوں سے الگ اگر ناول کی تاریخ میں انشاپردازانہ اسالیب بیان کی تلاش کیجئے تو انیسویں صدی میں نذیر احمد کے

ساتھ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ شرر کا تو یہی اختصاص ہے کہ وہ تاریخ اسلام سے اپنے ناولوں کا مواد اخذ کریں۔ رتن ناتھ سرشار نے لکھنؤ کا زوال، مسلم معاشرے کا زوال اور اقدار قدیم کی پسپائی کی جو داستان سرائی کی ہے، اس میں بھی مسلمانوں کے عروج وزوال کی پرچھائیاں ہر صفحے پر موجود ہیں۔ رتن ناتھ سرشار کے مذہب پہ مت جائیے، وہ اپنے شہر اور اپنی تہذیب کا ماتم کرتے ہیں جو دوسرے لفظوں میں عام مسلم سماج اور مسلمانوں کے تل تل گم شدہ ہونے کی کہانی ہے۔

سرشار نے اگر انشاپردازانہ مہارت حاصل نہیں کی ہوتی تو لکھنؤ کی پُر تکلف زندگی کی ایک ایک سانس اور دھڑکن وہ کیسے قید کرسکتے تھے؟ اودھ کی جس گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں اردو انشاپردازی کا جو نیا شاہ کار سرشار کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچا؛ اس میں عروج اور زوال، ہار اور جیت، خواب اور حقیقت کا ایک گھماسان مچا ہوا ہے۔ ہر مقام پر یہ سوال موجود ہے کہ آخر مسلمانوں کی تاریخ کے احوال رقم کرتے ہوئے زبان میں شوکت کا سکہ قائم ہونا ہی تھا۔

پریم چند کی عظمت اپنی جگہ لیکن انہوں نے سادگی بیان کو ایسا آخری حربہ بنایا جس سے فکشن تمام و کمال انشاپردازی سے دور ہوتا گیا۔ نثر سادہ کا طوفان اس قدر زور آور تھا کہ مرصع اور مسجع نثر نگاروں کیلئے مواقع محدود ہوتے چلے گئے۔ پوری بیسویں صدی کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی خدمات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ پریم چند کے گہرے اثرات میں انہیں ایک ایسی دائمی زبان حاصل ہوگئی جس کا انشاپردازی سے کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ حالانکہ وہی پریم چند جب ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کی تہذیب کو پس منظر کے طور پر پیش کرکے دنیا کا سب سے انمول رتن' جیسا افسانہ قلم بند کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ انشاپردازی کے سارے آداب سے واقف ہیں اور ایسی نثر کے تکلف، تہذیب اور نفس مضمون کے جادو سے لیس ہوکر ہی قصہ نویسی کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔

سادگی زبان کو پریم چند نے رواج عام بخشا اور اپنی انشاپردازی سے دست بردار ہوگئے۔ ان کے بعد لکھنے والوں میں اشتراکیت کا اس قدر زور رہا ہے کہ پہلی منزل پر مذہب اور دوسری منزل پر انشاپردازی یعنی خواص کی زبان سے علاحدگی ہی افسانہ نگاروں کا اصل ایمان ثابت ہوئی۔

ایسے ماحول میں صرف قرۃ العین حیدر نے پریم چند کی روایت اور زمانے کے رواج کے برخلاف جاکر اپنی تخلیقات میں انشاپردازی کو اہمیت عطا کی۔ قرۃ العین حیدر نے جو نیا اسلوب بیان گڑھا، اس کے داخل میں تاریخ، تہذیب اور بالواسطہ طور پر مذہب اسلام کی روایات کا بڑا دخل ہے۔ قرۃ العین حیدر کی مشہور فیشن زدگی اور جدت پسندی کا شور بہت ہے لیکن ان کی نثر میں تاریخ اور تہذیب کے ساتھ ساتھ تصوف اور سیریت کے مظاہر جس سلیقے سے، اپنے رنگ ڈھنگ اور وقار کے ساتھ پیش ہوئے ہیں، اسی سے ان کی زبان ایک علاحدہ ذائقہ رکھتی ہے، آگ کا دریا، ہو یا 'کارجہاں دراز ہے' قرۃ العین حیدر نے اسلام یا مسلمانوں کی تاریخ سے ہمیشہ علاقہ رکھا اور اسی سے اپنی نثر کے رومانی اور مہتم بالشان طور کو ابھارنے میں وہ کامیاب ہوئیں۔ عظیم مصنفین کی شخصیت اور ان کی کتابوں کی تفہیم کے مراحل پرت در پرت کھل کر آسان ہوتے ہیں۔ اس لئے قرۃ العین حیدر کے ظاہری انداز سے یہ

سمجھنا شاید دھوکہ ہو جائے کہ وہ مذہب اسلام یا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ صحیح ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے فکشن میں تاریخ اسلام کے علاوہ نئی دنیا کے مختلف مظاہر بھی شامل کئے۔ ایک ماہر قصہ گو کی طرح انہیں اپنی تحریروں کی بوقلمونی کا خود خیال تھا۔ لیکن ذرا یہ سوال سوچئے کہ قرۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کی تاریخ سے تعلق نہیں رکھا ہوتا تو کیوں کر وہ دلفریب اور جادو نگار انشاپردازانہ عنصران کی پہچان کا حصہ بن سکتا تھا؟

قصہ گوئی کی ایک جہت ڈرامانویسی بھی ہے۔ عام طور پر یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ڈراموں کا اسلامی تہذیب سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے اردو میں ڈرامانویسی کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوسکی۔ لیکن اردو کے بعض ذہین ڈرامانگاروں نے اس صورت حال کا سلیقے سے مقابلہ کیا اور محدود پیمانے پر ہی سہی لیکن کبھی ہندوصنمیات اور کبھی یونانیوں کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی۔ مرزا امانت اور آغا حشر نے اپنی انشا پردازی کے اجزا کو مرتب اور متعین کرنے کیلئے آس پاس کی تہذیبوں کا سہارا لے کر اپنی تحریروں کو نکھارا۔ آغا حشر نے اردو، فارسی شاعری کا بے دریغ استعمال کر کے پُر تکلف فضا پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اردو ڈرامے کی تاریخ میں امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔ تاج کی انشاپردازی کا سب لوہا مانتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ غور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ ڈرامانگار نے بے جان لفظوں میں کہاں سے خون اور پانی سینچا ہے۔ میرا معروضہ ہے کہ تاج نے سلطنت مغلیہ یعنی ایک مسلم بادشاہ کی زندگی سے قصے کو اخذ نہیں کیا ہوتا تو انشا کا وہ طلسماتی رعب، خواب ناک وقار کیسے میسر آتا۔ مسلمان بادشاہوں کے دربار کی فضا قائم کرنے کیلئے تاج نے اردو ہی نہیں فارسی کے عارفانہ کلام کی شمولیت سے اپنے ڈرامے کو اردو انشاپردازی کی تاریخ میں ایک انوکھی مثال کے طور پر پیش کردیا ہے۔

ختم کلام سے پہلے ایک لحظہ کے لئے غیر افسانوی ادب کی طرف آتے ہیں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور ابوالکلام آزاد کی انشاپردازانہ حیثیت کے بارے میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟ ان کے مطالعے کے میدان اور خاص دلچسپی کا علاقہ بہر طور مذہب اسلام سے براہ راست متعلق ہوجاتا ہے۔ سب کے سب مسلمانوں کی تاریخ کے شیدا اور خوشہ چیں ہیں۔ ان کے اسلوب میں سالمیت، ٹھہراؤ، وقار، سنجیدگی، روانی، شادابی، خواب، حقیقت اور نہ جانے کتنے طلسمات ہیں جو انہوں نے اپنی انشاپردازی کے بطن میں شامل کردیئے ہیں۔ آج ان صاحبان نظر پر تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں لیکن میں اردو نثر کی تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات پورے ادب کے ساتھ گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ اردو تنقید نے ہماری زبان کی مذہبی بنیادوں پر خاطر خواہ غور وخوض نہیں کیا۔ یہ مطالعہ مکتبی اوزاروں کے ساتھ ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ تفہیم کے آداب ہر طور پر ادبی ہی ہوں۔ خاص طور پر زبان کی باریکیوں پر غور کرنے والے نقادوں کو تو ان سوالوں سے نبرد آزما ہونا ہی پڑے گا کہ انشاپردازوں کے لئے آخر تاریخ اسلام یا مسلمانوں کی زندگی یا مسلمانوں کی تاریخ کیوں کر ایک مرغوب جزیرہ ثابت ہوئی؟ مذہب بیزاری کے ماحول سے اردو ذرا باہر نکلے تو ہمارے نقادانِ کرام اردو انشاپردازی کے مذہبی انسلاکات پر غور وفکر کے لئے موقع نکال سکیں۔ ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ ☆☆☆

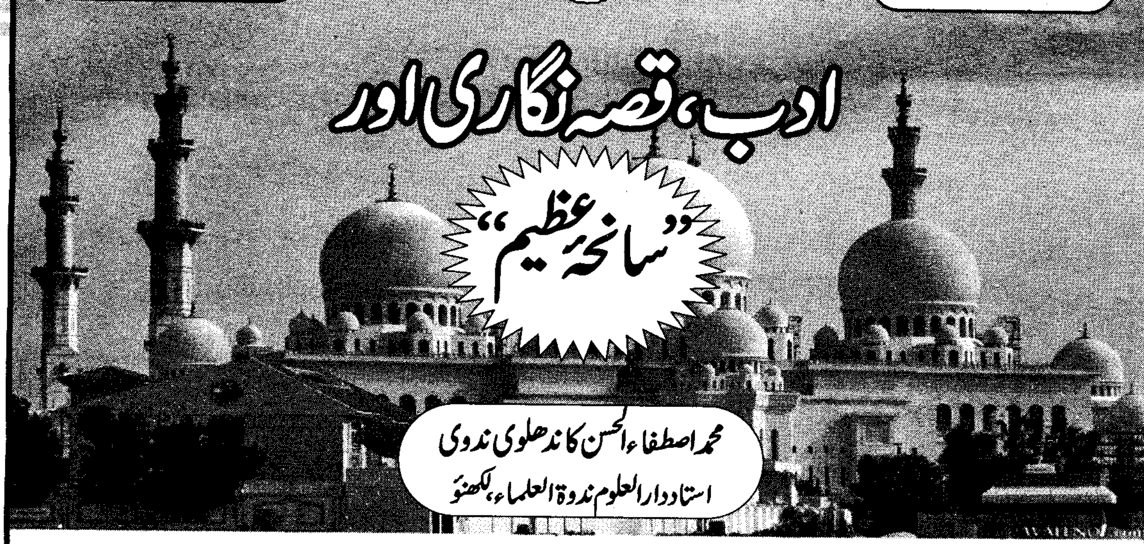

ادب، قصہ نگاری اور "سانحۂ عظیم"

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ادب میں نثری ادب کی ایک اہم صنف ’قصہ‘ بھی ہے۔اردو ادب میں قصہ نگاری (افسانہ) کی ابتداء ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں پریم چند سے ہوئی ہو یا اس سے ایک دو برس قبل یلدرم سے، دونوں نے ابتداء میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے۔ پریم چند نے انگریزی ادب سے اس فن کو چُرایا تو یلدرم نے ترکی زبان سے اس کے نمونے اردو میں پیش کئے۔ بعدازاں دونوں نے طبع زاد قصہ نویسی بھی کی اور اپنے فن اور کلا کو آگے بڑھایا۔ یہ فن ان دونوں سے شروع ہوکر آج ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا اپنے بام عروج پر ہے، بڑے بڑے نام اس فن میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن سلیم الفطرت، صحیح المزاج اور مصلح الاخلاق قصہ نویس بہت کم ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے یہ فن ہمارے اردو معاشرے کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچا سکا۔

حالانکہ بعض دینی مزاج حلقوں سے اٹھنے والے قلم کاروں نے اس فن کو ایک نئی روشنی بخشی ہے، جن میں سے دو اہم نام ایک ماضی قریب میں مائل خیرآبادی اور ایک ان سے کچھ پہلے مولانا مقبول احمد سیوہارویؒ کے ہیں، جن کی نگارشوں نے نونہالان اردو کو بڑی پاکیزہ ذہنیت اور کردار بخشا، یہ دو نام بطورِ مثال ہیں، ورنہ ان کے علاوہ اور بھی مشہور قلم کار ہوئے ہیں جنہوں نے صالح ادب پیش کیا ہے، ان کے علاوہ ماضی قریب میں ایک تحریک بھی اٹھی جس کے تحت کئی دینی تنظیموں اور جماعتوں نے اسلامی قصوں کہانیوں کو اسکولوں کے نصاب کے لئے اہلِ قلم سے تحریر کرایا۔

لیکن ان لوگوں نے یا تنظیموں نے ادب الاطفال پر زور دیا، جہاں تک بالغ افراد کا تعلق ہے تو ان کیلئے جو نگارشات سامنے آئیں ان میں زیادہ تر تاریخی اسلامی ناول ہیں، جن میں تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور عظیم کرداروں کو پیش کیا گیا ہے، لیکن ساتھ میں داستان کو ’چٹپٹا‘ بنانے کے لئے عشق وتغزل کا بکھیڑا بھی شامل کردیا ہے، جس کا رنگ اتنا نمایاں ہے کہ ایک مجاہد، بہادر سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عاشق مزاج نوجوان بھی معلوم ہوتا ہے، اور قاری کی طبیعت پر اس کی بہادری کی داستان اثر انداز ہو یا نہ ہو، وہ

اس کی عاشق مزاجی سے لطف ضرور اٹھاتا ہے۔اس کے علاوہ بعض ناول نگاروں نے اپنی دینی اور صالح طبیعت کی بناء پر عام زندگی سے متعلق بڑے مؤثر اور مقبول ناول پیش کئے ہیں، لیکن ایسی کوششیں بہت محدود ہیں اور وہ بھی ماضی بعید میں، ایسے ناولوں میں ڈپٹی نذیر مرحوم کے ناولوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

تاریخی ناول نگاروں کے علاوہ اسلامی قصہ نگاروں کے یہاں ایک کمی رہی، اور وہ یہ کہ ان کے یہاں یکسانیت بہت عام رہی، خاص طور پر جو تحریریں بچوں کے لئے ہیں، ان میں بعض موٹی موٹی اخلاقی باتوں کے علاوہ واقعات کی گہرائی میں اترنے کی کوشش نہیں کی گئی، اور ماحول میں اتر کر جذبات واحساسات کی ترجمانی نہیں کی گئی، جن سے کہانیوں میں جان پڑجاتی اور قاری کی نظروں میں وہی منظر اپنے تمام کوائف کے ساتھ اس طرح آجاتا کہ کتاب کا ورق شق ہوجاتا اور وہ خود اسی دنیا میں پہونچ جاتا۔ یہ چیز ایک قصہ یا داستان یا افسانہ کا خاصہ ہوا کرتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قصہ نگاری میں Fiction لازمی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے، جو واقعات کو مربوط انداز میں اس کیفیت کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ قاری کا ذہنی تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا اور وہ طے نہیں کرپاتا کہ کہانی کو کہاں پر آئندہ کیلئے موقوف کرے۔

دراصل فکشن میں فنکار کو بعض احوال ومناظر کی اپنی طرف سے تخلیق کرنی پڑتی ہے، اور تاریخی سچے واقعات میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخی ناول نگاروں نے داستان عشق کو بطور فکشن شامل کیا تاکہ ناقدین کی نظر میں ان کا ناول 'ناول' بن جائے۔ یہ واقعہ ایک ناقابل حل عقدہ تھا جس کو حل کرنے کی ایک قابل قدر کوشش مولانا اجتباء الحسن صاحب کاندھلوی نے اپنی تحریر ''سانحۂ عظیم'' میں کی ہے۔ یہ کتاب آنحضورﷺ کی وفات کے وقت کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے، حجۃ الوداع سے مرض الوفات پھر وفات اور تجہیز وتکفین تک کے حالات کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مصنف شروع سے لے کر آخر تک وہیں موجود تھا، حالانکہ واقعات کی ترتیب بعض مقامات پر حقیقی نہیں ہے اور خود مصنف نے اس کی صراحت کردی ہے، لیکن پھر بھی اس نے اپنے زورِ قلم سے ایسا انداز برپا کیا ہے کہ گویا اسکرین پر فلم چل رہی ہو اور واقعات کا ایک تسلسل ہو، زبان ایسی سلیس، عام فہم اور شستہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا اس سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک طویل مضمون تھا جو مصنف نے اپریل ۱۹۶۸ء میں تحریر کیا تھا، جس کو لندن کے ماہنامہ ''فاران'' نے اپنے مئی ۶۹ء کے شمارہ میں شائع کیا تھا، اور اس وقت اس کو بہت پسند کیا تھا، پھر مصنف نے اس مضمون کو وسعت دے کر ۹۳ میں کتابی شکل میں شائع کیا، اور اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔

مولانا اجتباء الحسن کی یہ تحریر تاریخ اسلام کی قصہ نگاری میں ایک انقلاب نہیں تو ایک تنوع اور ترقی کی طرف پیش رفت ضرور ہے، جہاں ایمانی نکتہ نظر سے کتاب شروع کرتے ہی دل کی حالت بدلنے لگتی ہے، وہیں فنی اعتبار سے یہ تحریر ایک نایاب ولازوال تحریر ہے، سیرت پاک کا وہ نازک موضوع جہاں ایک حرف بھی اپنی طرف سے کہنا بے ادبی وگستاخی ہی

نہیں بلکہ عاقبت خراب کر لینے کے مترادف ہے، وہاں مصنف نے روایات کے گہرے مطالعہ سے اپنے اندر وہ وجدان پیدا کیا جس نے فکشن کی کمی کو پورا کر دیا، اس تحریر کو پڑھتے ہوئے بالکل ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ اپنے بعض لسانی خصائص یا طرز تحریر کی بنا پر کوئی افسانہ یا ناول نہ ہو، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عام طور پر جس نے درمیانی سائز کے تقریباً ۱۴۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اپنے ہاتھوں میں لیا پورا کر کے ہی دم لیا۔

ذیل میں اس کتاب سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے ایام علالت میں مدینہ منورہ کا ماحول اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”حالات کے اس ہولناک نرغہ میں سب کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی، سب کو تشویش تھی، اور ہر ایک کے سامنے ایک ہی سوالیہ نشان تھا، ان کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی رہتیں، اور چہرے کسی جھیل کی مانند اترے رہتے......ہونٹوں کی خشکی اور چہروں کی پھیکی اور مرجھائی ہوئی حالت ان کے اندرونی آزار کا عکس معلوم ہوتی تھی.....ہونٹ ہر وقت سسکنے کے لئے تیار رہتے.....ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں، حوصلے پست ہو چکے تھے، ان کو اپنی زندگی میں دور دور تک تاریکی نظر آتی تھی....“۔

وفات سے کچھ پہلے جب آپ ﷺ کی طبیعت تھوڑے وقت کے لئے سنبھلی تو اس وقت کی منظر نگاری کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

”مگر.....کہیں بہار کے ایک جھونکے سے پھولوں پر ہمیشہ بہار رہتی ہے، کہیں نسیم سحری کے ایک جھونکے سے پرندے خوش ہو کر ہمیشہ نغمہ سرائی کرتے ہیں، ہر خزاں کے سینہ میں بہار کی آمد کا پیغام موجود ہوتا ہے، اور ہر بہار کی چھاتی میں خزاں کے جھونکے ہوتے ہیں.......سمندر کی پُر سکون خاموشی طوفان برپا کر سکتی ہے....اور کسی کو کیا پتہ کہ آنے والے وقت نے ان کے لئے اپنی مٹھی میں کیا بند کر رکھا ہے۔“ پوری کتاب ایسی ہی عبارتوں سے عبارت ہے، مصنف نے کمالِ مہارت سے روایات کا ایسا سہل اور دل پذیر ترجمہ پیش کیا ہے جو اس کی عبارتوں میں مدغم ہو گیا ہے، اور کتاب و اقتباس کا فرق مٹ کر رہ گیا ہے، جس نے اس واقعہ نگاری کے حسن کو دو آتشہ کر دیا ہے، یقیناً مصنف نے اپنے دینی و علمی ماحول اور ڈوبے ہوئے مطالعہ سے اپنی فکر و وجدان کو صحیح سمت اور بھرپور قوت دی ہے جس نے اس کی کاوش کو واقعہ نگاری کا ایک نادر شہ پارہ بنا دیا ہے، اردو میں اس تحریر کے علاوہ شاید ہی کسی زبان میں اس طرح وفاۃ النبی کا کسی نے تذکرہ کیا ہو۔ یہ تحریر آنے والے قلم کاروں کے لئے ایک نمونہ ہے اور ادب اسلامی میں قصہ نگاری کے فن کیلئے ایک سنگ میل۔

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

☆

نذیر احمد کے اصلاحی ناول

اعجاز علی ارشد

صدر شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ-۵

نذیر احمد کو عام طور پر نہ صرف اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ ناول نگاری کے حوالے سے ان کی بعض صلاحیتوں کا اعتراف بھی ہوتا ہے۔ مگر ان کے ناولوں پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا رہا ہے کہ ان میں مقصد فن پہ حاوی ہوگیا ہے۔ اب اس مقصد کی تفصیل میں جائیے تو احساس ہوتا ہے کہ اس کا براہ راست تعلق اصلاح پسندی کی ان تحریکوں سے ہے جو نذیر احمد کے عہد میں پھل پھول رہی تھیں۔ ہم انہیں پوری طرح اسلامی تحریک تو نہیں کہہ سکتے مگر ان کا رشتہ بڑی حد تک اسلامی معاشرے کی تشکیل نو اور اصلاح سے یقیناً تھا۔

دراصل ۱۸۵۷ء کے Shock کے باوجود ہندوستانی معاشرے کی عمومی صورت حال بہت امید افزا نہیں تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بیداری میں بھی ایک کیفیت نیم خوابی تھی۔ ایسے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر بھی قدرے دھندلا تھا اور اس میں سرمئی اجالے یا چمپئی اندھیرے کی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی لادینی تصورات کے خول سے باہر نکلنے یا اپنی صفوں کو صحیح اسلامی تقاضوں کے تحت ترتیب دینے کی جو خواہش دلوں میں جاگی تھی وہ قوی تو ہو رہی تھی مگر انقلاب بداماں نہیں تھی۔ عام ہندوستانی معاشرے کی طرح مسلم معاشرے میں بھی ایک جماعت مسلسل انگریزی حکمرانوں سے تعلق رکھنے والی ہر فکر اور شی سے نالاں اور بیزار تھی، جب کہ دوسری جماعت نئی تہذیب کی ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھنے پر اصرار کر رہی تھی۔ پھر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے چولے تو بدل گئے تھے مگر دل نہیں بدلے تھے۔ حالانکہ قوم کے دل میں احساس زیاں بھی تھا اور دماغ میں اسلامی قدروں کی طرف رخ کرنے کا ایک رجحان بھی موجود تھا مگر اصلاح کے لئے مختلف تنظیموں یا افراد کا انداز الگ الگ تھا۔ بہت سامنے کی مثال سرسید اور نذیر احمد کی ہے۔ دونوں میں سے کسی کی نیت پر شک کرنا غلط ہوگا مگر دونوں کا نقطۂ نظر اور اسی مناسبت سے طریقۂ کار خاصا مختلف رہا ہے۔ ایسے میں دیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ نذیر احمد نے اپنے قصوں میں جو اسلوب اختیار کیا وہ کس حد تک مؤثر اور کامیاب ہے۔

''مراۃ العروس'' سے ''رویائے صادقہ'' تک پچیس برسوں کے دوران نذیر احمد نے کل سات ناول لکھے اور کم و بیش ہر ناول میں مسلمانوں کے درمیان موجود کسی نہ کسی گمرہی یا کج روی کی طرف اشارہ کیا۔

قصوں کی تفصیل میں جانے کی شاید ضرورت نہیں چونکہ

ان ناولوں کے متن سے اکثر اہل ادب واقف ہیں۔ یہاں صرف اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن مذہبی نکات یا مباحث کو ان ناولوں میں اٹھایا گیا ہے ان کے پیش نظر "توبۃ النصوح" سے لے کر "رویائے صادقہ" تک ہر ناول ناقدین کی نگاہ میں اعتراض کے قابل رہا ہے۔ حالانکہ بظاہر سخت گیر سمجھے جانے والے ناقد کلیم الدین احمد نے ناول میں کسی نقطہ نظر یا مقصد کی پیش کش کو جائز قرار دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"شعر کی طرح ناول بھی ادب کی ایک شاخ ہے لیکن اس حقیقت کو ہم بھول جاتے ہیں اور ناول سے متعلق کچھ اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے وہ ادب نہیں محض ایک تفریح ہے۔ناول کا مقصد تفریح نہیں۔ اس کا بھی وہی مقصد ہے جو شعر کا ہے، جو ڈرامے کا ہے' جو ادب، جاندار ادب کا ہے۔"

(مقالہ'ناول کا فن' مطبوعہ معاصر جلد ۲۳ ۱۹۷۳ء)

صاف ظاہر ہے کہ دوسری اصناف ادب کی طرح ناول کا مقصد بھی اپنے قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت فراہم کرنا ہے مگر ہمارے ناقدین کا یہ حال ہے کہ نذیر احمد پر تحقیق کرنے والے ایک صاحب اگر "ابن الوقت" کی طویل تقریروں کے سبب اس ناول کو ناکام سمجھتے ہیں تو دوسرے مذہب سے دلچسپی کے سبب "رویائے صادقہ" کو دینیات کا رسالہ قرار دیتے ہیں۔خود میں نے آج سے پچیس تیس برس قبل اپنی کتاب "نذیر احمد کی ناول نگاری" میں نذیر احمد کو" ریش اصلاح" کا اسیر ہونے کے سبب فنی لطافتوں سے دور سمجھا تھا۔ مگر آج غور کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں میں وعظ و نصیحت کی جو صورت موجود ہے وہ ان کی افتاد طبع کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے عہد کا تقاضا ہے۔اور ان کی اصلاح پسندی کا بنیادی سبب ان کی مولویت یا مذہبی شغف سے زیادہ ملک گیر سطح پر چلائی جانے والی اصلاحی تحریکیں ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اصلاح پسندی ہمیشہ فنی ہنرمندی کے مقابل نہیں آتی، کبھی کبھی اس کی مدد بھی کرتی ہے۔

اب سوال دو ہیں۔ایک تو یہ کہ "آخر نذیر احمد کے ناولوں میں اصلاح معاشرہ کی جو کوششیں ملتی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ ان کوششوں کو کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی۔ پہلے سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے نذیر احمد کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو چند نکات واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ایک تو یہ کہ ان کے ناولوں میں ابتداء سے مسلم معاشرے کو موضوع بناتے ہوئے ایسے کرداروں کو سامنے لایا گیا ہے جو اسلامی شعائر سے دوری کے سبب عبرت انگیز بن گئے ہیں "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" کی اکبری مسلم عورتوں کی جہالت کا مرقع ہے۔نصوح سے تربیتِ اولاد کے معاملے میں جو کوتاہی ہوئی اس کا نتیجہ کلیم اور نعیمہ کی گمراہی کی صورت میں سامنے ہے۔ دینی فرائض سے لاپرواہ یہ دونوں کردار عبرت انگیز تو ہیں مگر قارئین کی ہمدردی بھی بٹورتے ہیں۔اور یہ ناول نگار کا وصف ہے۔کم وبیش یہی بات "فسانۂ مبتلا" کے مرکزی کردار کے حوالے سے کہی جاسکتی ہے۔"ابن الوقت" کا موضوع بظاہر مشرقی و مغربی تہذیب کا ٹکراؤ ہے مگر یہاں بھی ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کا جذبہ موجود ہے۔ اسکے مرکزی کردار کی مغربی تہذیب سے رغبت بھی فطری ہے اور مذہب کی طرف واپسی کا سفر بھی بے حد حقیقی ہے۔اب رہی بات آخری دو ناولوں یعنی 'ایامیٰ' اور' رویائے صادقہ" کی تو ان کا موضوع براہ راست اسلامی معاشرہ ہے۔

اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ناول نگار معاشرے کے صرف خارجی احوال ہی بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے داخلی تضادات پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں مگر اتنا اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تعدد ازدواج، بیوہ عورتوں کی دوسری شادی اور بعض مذہبی امور کی عقلی توجیہہ کے حوالے سے مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جو اختلاف اور تصادم موجود تھا اسے بھی نذیر احمد نے بڑی خوبصورتی سے قصوں کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ آخری ناول تو گویا ان کے مذہبی رجحانات کا نچوڑ ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اپنے تمامتر مذہبی پس منظر اور رابطوں کے باوجود وہ ایک خاص نوع کی مولویانہ ذہنیت کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

''ایک مسلمان تو قرون اولیٰ کے مسلمان تھے یا ایک مسلمان ہمارے زمانے کے مولوی ہیں کہ بات بات پر لوگوں کو کافر یعنی اسلام سے خارج ٹھہرا دیتے ہیں۔ ابن الوقت تو ان کے نزدیک نرا کافر بھی نہیں بلکہ مجموعۂ کفار تھا۔ حنفی، شافعی، سنی، شیعہ، وہابی، بدعتی، مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں، سب کے علماء نے قرآن کی آیتوں سے، حدیثوں سے سند پکڑ پکڑ کر بالا جماع ابن الوقت کے کفر کے فتوے لکھ دیئے۔ ایک فتویٰ تو خود ہماری نظر سے بھی گذرا، فتویٰ کا ہے کو تھا اچھا خاصا اقلیدس کا پہلا مقالہ معلوم ہوتا تھا کیوں کہ مربع، مستطیل، بیضوی سب شکلوں کی تو مہریں اس میں تھیں اور پھر بعضی کف دست کے برابر چوڑی چکلی، طغرے کیسے کیسے پیچیدہ کہ ہمایوں کی بھول بھلیاں کی کیا اصل ہے''۔

''مولویوں کی طرف سے تو ہاتھ دھو رکھئے۔ یہ مولوی یوں بات بات میں ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں، جھگڑتے بھی ہیں، یہاں تک کہ سارے شہر میں کوئی ایک مولوی بھی ایسا نہیں نکلے گا جس کی نسبت کفر کے فتوے نہ لکھے گئے ہوں۔ مسلمانوں میں جتنے مولوی و تنے گروہ۔ ایک کے پیچھے ایک بلکہ ایک کے ساتھ ایک نماز پڑھنے تک کا روادار نہیں۔''

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف تو نذیر احمد مذہبی عقائد اور شعائر سے مسلمانوں کی وابستگی پر زور دیتے ہیں اور دوسری طرف بہت زیادہ سخت گیری کی جگہ وسیع القلبی سے کام لینے کے قائل ہیں تاکہ بغیر کسی ردعمل کے مسلم معاشرے کی اصلاح ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل فطری اور مؤثر تو ہے لیکن اس میں خطرے بھی کئی ہیں۔ اول تو گمراہ طبیعتوں کو نصیحتیں بہت گراں گذرتی ہیں۔ دوسرے قصہ گوئی کا فن آگے بڑھتا ہے تو اس میں نئی جہتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ جو پیغام آج پیش کیا گیا ہے وہ آنے والے دنوں میں اتنا اہم نہ رہے یا بے معنی ہو جائے۔ ایسے میں ناول نگار کی مقبولیت کم ہو سکتی ہے یا وہ غیر اہم بھی ہو جا سکتا ہے۔ مگر نذیر احمد کے ناول صرف اپنے عہد میں ہی مقبول نہیں رہے بلکہ اپنے تمامتر مذہبی پس منظر، آیات و احادیث کی پیش کش اور وعظ و نصیحت کی فراوانی کے باوجود تقریباً ڈیڑھ سو برس گذر جانے کے بعد بھی عوام الناس میں مقبول ہیں اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر نذیر احمد کو Role Model نہ تسلیم کیا جائے تب بھی اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ جن اصلاحی نکات کو روایتی ناقدین ادب ناول نگار کی کمزوری سمجھتے اور سمجھاتے رہے ہیں وہی اس کی توانائی کا سرچشمہ ہیں اور جس انداز بیان کو عیب شمار کیا گیا ہے وہ نذیر احمد کا اپنا ہنر ہے۔

قصہ نگاری اور اردو کی قدیم مثنویاں

ڈاکٹر منظر اعجاز

مثنوی اپنی ہیئت و ماہیت اور ساخت و پرداخت کے لحاظ سے بے پناہ وسعتوں کی حامل تصور کی جاتی ہے۔ یہ ایک بیانیہ، توضیحی اور منظوم صنف سخن ہے۔ اس کا فن مرکب، پیچیدہ، بسیط اور دوہری تراکیب کا حامل ہے۔ اس میں افسانویت بھی ہوتی ہے اور نظمیت بھی۔

سید جلال الدین کی زبان میں یہ ایک ایسی جامع اور مکمل صنفِ شعر ہے جس میں تمام اصناف سخن کے نمونے موجود ہوتے ہیں۔ اور بقول عبد القادر سروری ہماری شاعری میں یہ سب سے اہم صنف ہے کیوں کہ اس میں ایک وسیع مضمون اور مربوط خیال کی نشو ونما کی گنجائش ہے۔ اسی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالی نے اسے اصناف سخن میں سب سے زیادہ کارآمد صنف کہا ہے اور شبلی نے بھی شعر العجم میں لکھا ہے کہ انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخیل، ان تمام چیزوں کے لئے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔

بیانیہ نظم ہونے کی وجہ سے مثنوی میں بیک وقت قصہ اور نظم دونوں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح مثنوی نگار پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسے نہ صرف قصہ سننا پڑتا ہے بلکہ اس قصے کو اشعار کے پیرائے اور نظم کے سانچے میں بھی ڈھالنا پڑتا ہے قصہ نگاری کے تمام لوازمات مثلاً کردار نگاری، واقعہ تراشی اور فضا آفرینی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کے مطالبات و شرائط سے بخوبی عہدہ برآ ہونا ایک مثنوی نگار کی عظمت کی دلیل سمجھی جاتی ہے لیکن عملی طور پر اس عظمت کا استحقاق ثابت کرنا نہایت ہی دشوار ہوتا ہے۔

مثنوی میں قصہ کے لحاظ سے کردار، واقعہ، فضا اور مجموعی طور پر قصہ پن جسے ماجرا یا پلاٹ کہا جاتا ہے، کا ہونا لازمی قرار دیا جاتا ہے کیونکہ محمد حسین آزاد کے خیال میں ایک سرگذشت یا بیان ماجرا ہے اور بقول امیر احمد علوی واقعہ نگاری کے لئے اس نوع سے بہتر مشرق کی شاعری میں کوئی اسلوب نہیں اور نظم ہونے کی وجہ سے مثنوی میں ابتداء، وسط اور انتہا کا احساس ہونا لازمی ہے۔ نظم میں الفاظ کی خوبصورتی اور طرز ادا کی اہمیت بھی مسلم ہے لیکن الفاظ اور طرز ادا وغیرہ میں معاشرہ، ماحول اور زمانے کے لحاظ سے تبدیلی آتی رہتی ہے۔

جہاں تک مثنوی کی روایت کا تعلق ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہماری اردو شاعری میں یہ ایران سے آئی ہے۔عرب میں اس کی کوئی باضابطہ روایت نہیں ملتی ۔ البتہ عرب کی رجز یہ شاعری میں مثنویت تلاش کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی شعراء نے رجز ہی سے مثنوی کی ہیئت اخذ کی ۔ کیونکہ رجز کی ہر بیت مثنوی ہی کی طرح ایک مستقل مطلع ہوتی ہےاوراس میں بھی مسلسل اور مربوط خیالات وواقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

لیکن یہ تقلید بقول علامہ شبلی اجتہاد سے بڑھ کرتھی لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مثنوی خود ایران کی ایجاد ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ لفظ مثنوی عربی ہےاور مثنیٰ سے ماخوذ جس کے معنی ہیں اثنین ۔اثنین یعنی دو۔دو! بیک جنبش قلم ایران میں کسی شاعر کو مثنوی کا موجد قرار دینا مشکل ہے کیونکہ اس سلسلے میں کافی اختلافات ہیں۔البتہ مثنوی کی روایت کی تشکیل میں ابوشکور بلخی ،رودکی ،دقیقی ،فردوسی ،سنائی ،عطار، رومی اورامیرخسروکی کارگزاریاں متفقہ طور پر اہمیت کی حامل قراردی جاتی ہیں۔

جہاں تک اردو میں مثنوی نگاری کا تعلق ہےتو خود زبان اردو کی ابتدائی نشو ونما ہی کی طرح اردو مثنوی کی ابتدائی تشکیل میں صوفیائے کرام کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔لیکن ایسی ابتدائی مثنویوں کا تعلق مذہبیات سے ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے ’’کدم راو پدم راؤ‘‘ کو طویل مثنویوں کا قدیم ترین نمونہ تسلیم کیا ہے جس کا تعلق خالص ہندی روایت سے ہے اور یہ مثنوی ڈاکٹر پرکاش مونس کے مطابق علاء الدین حسن بہمن کے دورحکومت میں تصنیف کی گئی اور علاء الدین کے پوتے احمد شاہ ملقب بہ نظام شاہ کے عہد میں دربار میں پیش کی گئی ، اس لحاظ سے یہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط کی تصنیف قراردی جاسکتی ہے۔

بہرحال اس مثنوی کا قصہ مختصراً یہ ہے کہ:

’’ راجہ کدم راؤ اکھرناتھ نام کے ایک جوگی کے جھانسے میں آکر اس سے تبدیلی قالب کا ہنر سیکھنا شروع کردیتا ہے ۔ اکتساب ہنر کے دوران جب ایک دفعہ راجہ کسی طوطے کے قالب میں اپنی روح منتقل کرلیتا ہےتو جوگی اکھرناتھ چالاکی سے راجہ کے قالب میں اپنی روح منتقل کرکے راجہ کدم راؤ بن جاتا ہے۔لیکن اس نقلی راجہ کے رویے سے رانی اور سارے درباری حیران وپریشان ہوجاتے ہیں۔ راجہ کا وزیر پدم راؤ ہمیشہ راجہ کو جوگیوں اور سنیاسیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا رہتا تھا لیکن راجہ پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے ۔ جوگی اکھرناتھ کی صحبت اختیار کرنے کی وجہ سے وزیر پدم راؤ راجہ سے ناخوش رہا کرتا تھا۔لیکن طوطے کی زبان سے جو اصل راجہ کدم راؤ تھا، جوگی کی چالاکی کا انکشاف ہوا تو پدم راؤ کی ناراضی بھی دور ہوگئی اوراس کی تدبیروں سے راجہ کدم راؤ اپنی اصل شکل میں آگیا اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے لگا چنانچہ عام طور پر یہ خیال رائج ہے کہ بہمنی سلطنت کے درباری شاعر فخرالدین نظامی نے کدم راؤ پدم راؤ میں ایک عشقیہ قصے کو نظم کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے عہد متعلقہ کے مذاق سخن اور زبان وبیان کے معیار کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے

،ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس نے دوررس اثرات قائم کئے چنانچہ چار سو سال بعد رجب علی بیگ سرور نے نثری داستان فسانۂ عجائب لکھی تو اس میں بھی تبدیلیٔ قالب کا وہی وطیرہ اختیار کیا۔ اور اٹھارہویں صدی میں شمالی ہند میں جو ایہام گوئی کی تحریک شروع ہوئی اس کے ابتدائی نقوش اردو میں فخرالدین کے حوالے سے دریافت کئے جاسکتے ہیں۔

اگر اردو مثنوی کی ارتقائی سمت ورفتار پر روشنی ڈالنا مقصود ہوتا تو یہاں میراں جی شمس العشاق اور ان کی مثنوی خوش نامہ کا ذکر اولیت کا حامل ہوتا جس میں خوش یا خوشنودی نام کی لڑکی کو مرکزیت حاصل ہے۔ کہیں اسے مخاطب کرکے، کہیں سوال وجواب کی صورت میں اور کہیں خود اسی کی زبانی خالص ہندی پیرائے میں معرفت کے رموز واسرار بیان کئے گئے ہیں چنانچہ اس کا بنیادی تعلق متصوفانہ تجربات ومشاہدات سے ہے۔

فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے بعد ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' کو ہی قابل ذکر تصور کیا جاتا ہے۔ غالباً اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اس سے قبل کی تقریباً تمام مثنویاں ماخوذ ہیں جبکہ وجہی کی قطب مشتری طبع زاد ہے۔ وجہی سے پہلے شیخ احمد گجراتی کی دو مثنویاں ''لیلیٰ مجنوں'' اور یوسف وزلیخا'' ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تحقیق کی رو سے ادبی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہیں ہرچند کہ یہ بھی طبع زاد ہیں ان کے عنوانات ہی سے ظاہر ہے کہ لیلیٰ مجنوں کا تعلق اگر عربی داستان سے ہے تو یوسف وزلیخا قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ باوجود اس کے یہ وہ ادبی کارنامے ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو مثنوی کے ارتقائی سفر میں ان کی حیثیت قطب نما کی سی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ملا وجہی کو ''قطب مشتری'' کے حوالے سے اس سفر میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ وجہی نے اس میں تاریخ اور تخیل کے امتزاج سے جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ وجہی کی انفرادیت اور امتیاز کی دلیل ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اسی دور کی دوسری عشقیہ مثنویوں میں غواصی کی ''سیف الملوک وبدیع الجمال'' اور مقیمی کی ''چندر بدن وماہ یار'' کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ملا وجہی اپنے زمانے کا قادرالکلام شاعر اور عدیم المثال نثار ہے وہ محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر یا ملک الشعراء تھا۔ فن اور اپنی شخصیت کے لحاظ سے سولہویں صدی عیسوی کا یہ شاعر انیسویں صدی کے غالب سے کم نہیں۔ ان دونوں میں کچھ قدر مشترک بھی ہے۔ وہ رند مشرب بھی تھا اور شاہد باز بھی لیکن تصوف واخلاق کے موضوع پر اس نے تاج الحقائق'' کی تصنیف کی تاہم اس کی شہرت ومقبولیت کا انحصار مثنویٔ قطب مشتری'' اور نثری داستان ''سب رس'' پر ہے۔ انہیں دو کتابوں کے حوالے سے اس کا نام ہیرے کی سی چمک دکھاتا ہے اور اسی مناسبت سے جاوید وشسشٹ نے ملا وجہی کو گولکنڈا کا ''کوہ نور ہیرا'' قرار دیا ہے۔

ملا وجہی کے قول کے مطابق قطب مشتری صرف بارہ دنوں میں مکمل ہوئی جس کی تصنیف آج سے تقریباً چار سو سال پہلے یعنی ۱۶۰۹ میں ہوئی۔ اس میں بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کے معاشقے کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ قصہ نور جہاں اور جہانگیر کے معاشقے کی طرح تاریخی صداقت سے قریب ہے خود قلی قطب شاہ کی کلیات میں ''حیدر محل بھاگ متی'' کے

عنوان سے نظم موجود ہے۔قلی قطب نے ڈنکے کی چوٹ پر اس کے پاتر (رقاصہ یا طوائف) ہونے کا اعلان کیا ہے بھاگ متی کا ذکر ابوالفضل نے اکبرنامہ میں اور فیضی نے لطیفہ فیاضی میں کیا ہے۔فیضی یوں لکھتا ہے: ''محمد قطب الملک مذہب تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ متی کہ فاحشہ کہنہ وقدیم است۔''

اور تاریخ فرشتہ کا مصنف بھی: ''وآں قطب فلک اجلال دراوائل پادشاہی برفاحشہ بھاگ متی عاشق شدہ''۔ لکھتا ہے۔فرشتہ نے بھاگ متی کی قلی قطب اور دربار قطب شاہی سے بطریق امرائے سلطنت وابستگی ظاہر کی ہے۔یہ بھی ایک تاریخی صداقت ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کے نام پر ہی بھاگ نگر بسایا تھا اور جب اسے حیدر محل کے خطاب سے نوازا تو حیدر آباد کیا۔موجود حیدر آباد دراصل وہی بھاگ نگر ہے۔

قطب مشتری بلاشبہ ایک ادبی کارنامہ ہے جسے ملا وجہی نے صرف بارہ دن میں لکھا تھا۔

تمام اس کیا دیس بارا منے
سنہ ایک ہزار ہور اٹھا را منے

غواصی نے اپنی مثنوی سیف الملوک وبدیع الجمال صرف ایک ماہ میں مکمل کی تھی وہ کہتا ہے۔

برس یک ہزار ہور پنج تیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

اس میں الف لیلہ کی ایک داستان پیش کی گئی ہے اس لحاظ سے قصہ بہت پرانا ہے۔یہ قصہ حضرت سلیمانؑ کے عہد سے وابستہ ہے۔جیسا کہ غواصی خود کہتا ہے:

کہ حضرت سلیمان کے وقت پر
اتھا مصر میں راج یک بخت ور

اس قصہ کہنہ وقدیم کے بیان میں غواصی نے اپنی جدت طرازی کا بھی اظہار کیا ہے اور اپنی جمہور پسندی کا بھی ثبوت فراہم کیا ہے، یہ بالکل نئی چیز ہے۔وہ جہاں بدیع الجمال کے حسن کی تعریف میں یہ کہتا ہے کہ:

عجب نور کیسرا اتھا مکھ پہ تاب
کہ قربان اس مکھ پہ لک آفتاب

وہیں وہ ایک جشن کی تعریف میں بھی رطب اللسان دکھائی دیتا ہے۔اس طرح کے کردار پرانے قصے، کہانیوں میں حاشیے پر یا پس منظر میں دکھائی ہیں چنانچہ پیش منظر یا MAIN STREAM میں ایسے کردار کا لانا یا دکھانا جدت طرازی بھی ہے اور جمہور پسندی۔غواصی نے جشن کی پیکر تراشی میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔وہ کہتا ہے:

کہ زشتاں منے سخت ووزشت تھی
نپٹ روسیاہی میں انگشت
کہ تھا تھوبڑا اس کا جیوں فیل کا
سراس کا سو کالا انجن نیل کا
انکھیاں ڈونگیاں جیوں کھڈی سار کے
دو دیدہ بھترجوں پتھر گار کے

اسی طرح غواصی نے ہونٹ، ناک، ٹھوڑی، چوٹی، کمر اور کولھے، یہاں تک کہ پنڈلیوں اور پنڈلیوں پر اُگے بال کا بھی پیکر تراشا ہے اور پیکر تراشی کے اس عمل میں نادر تشبیہوں سے بھی کام لیا ہے، مقیمی کی ''چندر بدن وماہ یار'' میں ایک ہندو راجہ کی بیٹی چندر بدن اور ایک مسلمان عاشق ماہ

پار کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کے سلسلے میں خان رشید کا خیال ہے کہ قطب مشتری تشبیہ واستعارہ میں اپنا جواب نہیں رکھتی، سیف الملوک وبدیع الجمال میں جذبات نگاری کا کمال ہے لیکن چندر بدن اور ماہ پار ہر اعتبار سے مکمل اور اپنے دور کی سحر البیان سے کم نہیں۔ یہاں چندر بدن کی آخری گفتگو سے مقیمیؔ کے فنی طرز و اسلوب کا کسی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

سو ہے عاشقاں میں یو عاشق اول
کرے قصد مل جانے یہاں تے نکل
ملوں جائے بیگی میں اس پارسوں
جو واصل کروں جیوں اس پارسوں
سو خلوت تے جیوں بھار آئی ملوں
سہیلیاں کوں اپنی بلائی ملوں
سہیلیاں منے یک سہیلی کوں کھول
کہتی ہوں تجھے میں کہ یوں جاکے بول
کہی جارضالے توں سب کی رضا
میں جاکے دیکھوں عاشق ہے کس وضا
پدر ہور مادر کو بولو سلام!
کرو راج شاہی، رہو تم مدام
وداع ہے ننھے ہور بڑے سوں اتا
وداع ہے زخویشاں قرابت جتا
وداع ہے عزیزاں ودوبھایا ستی
وداع ہے پوپھا ناں ومایاں ستی
وداع ہے سہیلیاں رہو خوش مدام
کروں جاکے عاشق سوں کچھ ہم کلام
خدا پاس جو میں منگی بار بار
موے بعد مل کے رہیں ایک ٹھار
دعا تو مری دو کیا مستجاب
تو اے ماں رضادے کہ جاؤں شتاب
کہی الوداع الوداع الوداع
کہ ہوتی ہوں میں آج سب سے جدا

مقیمیؔ کی چندر بدن وماہ پار کے بعد ہمیں رستمیؔ کی ایک اہم اور طویل مثنوی ''خاور نامہ'' ملتی ہے۔ یہ دکن کی پہلی بڑی مثنوی ہے جو ۱۰۵۹ھ میں لکھی گئی۔ اور جس میں بقول عبدالسلام ندوی اور ڈاکٹر ممتاز احمد اسی ہزار (۸۰۰۰۰) اشعار نظم کیے گئے تھے۔ اس حیثیت سے یہ مثنوی بہ لحاظ طوالت فردوسیؔ کے شاہنامے سے بھی طویل اور ضخیم ہے۔ اسی عہد میں نصرتیؔ کی بزمیہ مثنوی ''گلشن عشق'' اور رزمیہ مثنوی علی نامہ ملتی ہیں۔ ان مثنویوں کا شمار دکن کی اہم مثنویوں میں ہوتا ہے ''علی نامہ'' ''شاہنامہ'' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ نصرتیؔ نے اسے دکن کا شاہنامہ قرار دیا ہے جیسا کہ اس کے درج ذیل شعر سے واضح ہے:

کیا ہوں سخن مختصر بے گمان
کہ یو شاہنامہ دکن کا تو جان

نصرتی کے بعد ''پھولبن'' کے حوالے سے ابن نشاطی مشہور ہے۔ یہ مثنوی کنچن پٹن کی یاد دلاتی ہے:

کتے یک شہر مشرق کے کدھن تھا
کہ اس کا نانون سوں کنچن پٹن تھا

ابن نشاطی خود مثنوی کے نام اور تاریخ تصنیف کے بارے میں لکھتا ہے:

صفادار اس کے دیک ہریک چمن میں
رکھتاہوں نانون اس کا پھولبن میں
اتھا تاریخ تو لایا یہ گلزار
اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پرچار

سلاست اور سادگی کے ساتھ ابن نشاطی کی پھولبن صنائع کا بھی عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے نشاطی خود بھی صنعت گری میں اپنی مہارت کا دعویدار نظر آتا ہے وہ کہتا ہے:

جو کئی صنعت سمجھتا ہے سو گیانی
وہی سمجھے مری یونکتہ دانی
وہی سمجھے سمجھ ہے جس کوں کچھ بات
جو میں باندیاں ہون یو صنعت کوں ابیات
ہنر کوئی دکھائے سو دکھایا
صنائع ایک کم چالیس لایا

ڈاکٹر پرکاش مونس کا خیال ہے کہ پھولبن فارسی بساتین کا ترجمہ ہے لیکن اس کے بیشتر تصورات ہندی کے افسانوی ادب سے ماخوذ ہیں۔ بادشاہ کی درویش سے عقیدت ہندو راجاؤں کی جوگیوں سے عقیدت کی یاد دلائی ہے۔اس میں اسلامی عناصر کے ساتھ ساتھ ہندی عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں گوہر مراد پانے کے لئے جوگی بن کر نکلنا قدیم ہندوستانی روایت ہے۔ پھولبن میں سندھ کے بادشاہ اور مصر کے بادشاہ کی جنگ کے بعد شہزادی یہی راستہ اختیار کرتی ہے ابن نشاطی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ کسی دربار سے وابستہ نہیں تھا۔ابن نشاطی کی مثنوی پھولبن'' کے بعد ادبی حیثیت سے قاضی محمود بحری کی ''من لگن'' قابل ذکر ہے یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے جو عہد عالمگیر میں تصنیف ہوئی۔من لگن پر ہندی تصورات وعقائد اور فکر و فلسفہ کے اثرات کے ساتھ ہندی الفاظ، تشبیہات واستعارات اور تلمیحات کا بھی گہرا اثر ہے۔بحرؔی اپنی زبان ہندی بتاتے ہیں اور اسے آسان قرار دیتے ہیں۔موضوع کو معرفت'' سے متعلق بتاتے ہیں۔

چالیس برس یہی تھی مستی
یو شعر یو شاہداں پرستی
ہندی تو زباں ہے ہماری
کہتے نہ لگے ہمن کو بھاری
ہربول میں معرفت کی بانی
سیتا کی نہ رام کی کہانی

اورنگ زیب کی سیاسی حکمت اور فوجی عمل سے قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کا نہ صرف وجود مٹ گیا بلکہ ادب میں دکنیت کی بہار کا منظر بھی کہرے کی دھول بن گیا۔اس دھند میں شمال وجنوب کی سرحد گم ہوگئی۔ یہ دونوں خطے ایک ہوگئے۔دل ملے، قلم ملے۔دلی اور دکن کے سیاسی فاصلے ہی کم نہیں ہوئے،ادبی دوری بھی کم ہوئی اس کے باوجود ولؔی اور سراج تک دکنیت کے آیات و آثار تابندہ نہ سہی لیکن زندہ ضرور رہے۔

یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ولؔی کے چراغ سے ہی شمال میں اردو شاعری کی شمع روشن ہوئی حالانکہ ولؔی کو اردو نظم کی نسل کا آدم نہیں مانا جاتا لیکن اردو نظم کا مجدد ضرور تسلیم کیا جاتا ہے۔ولؔی کے سرمایہ سخن میں بھی دو مثنویاں ملتی ہین جن میں ایک ''در تعریف سورت'' بھی ہے۔سورت کی تعریف میں ولؔی کی گل افشانی گفتار موسم بہار کے نغمے کی حیثیت رکھتی

ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

عجب شہراں میں ہے پُرنور یک شہر
بلاشک وہ ہے جگ میں مقصد دہر
رہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
کنارے اس کے اک دریا ہے تپتی
کہ دنیا دیکھنے کو اس کے پٹی
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم
صبح ہور شام جپ کرتا ہے عالم
نزد قلعہ کے باڑا گھاٹ ہے وہاں
کہ دائم گلرخاں کا ہاٹ ہے وہاں
رہے سورت حقیقت کی نشانی
کہ ہیں معمور وہاں اہل معانی
شرافت میں یہ ہے جیوں باب مکہ
توہے سب ملک پر اس کا ہی سکہ
اتی آتش پرستاں کی ہے بستی
سکھے نمرود واں آتش پرستی
فرنگی اس میں آتے ہیں کلہ پوش
عدووہاں جن کی گنتی میں ہے بیہوش
بھری ہے سیرت وصورت سوں سورت
ہراک صورت وہاں انمول مورت

اس کے باوجود مثنوی نگاری میں ولی کو وہ مقام ومرتبہ حاصل نہ ہوسکا جو سراؔج کے حصے میں آیا سراؔج کی مثنوی ''بوستان خیال'' دبستان دکن کا اعلیٰ وارفع ادبی کارنامہ ہے۔ عبدالقادر سروری نے ''پھولبن'' کے مقدمے میں ''سحرالبیان'' کے بعد اسکو دوسرا درجہ دیا ہے یہ مثنوی ۱۱۶۰ھ میں لکھی گی۔ اسی مناسبت سے اس میں گیارہ سو ساٹھ اشعار ہیں۔ تصنیف کی تاریخ 'بوستان خیال'' سے حاصل کی گئی ہے:۔

زبس اس میں ہے سیر گلشن تمام
رکھا بوستانِ خیال اس کا نام
عدد جبکہ اس نام کے آئے ہاتھ
مطابق ہوئے سال وابیات ساتھ
یہ دودن کی تصنیف ہے حسب حال
زباں پر نکل آیا دل کا ابال

آخری شعر سے سراج کی زود بیانی اور قادرالکلامی واضح ہے اور یہ بھی بیان واقعہ ہے کہ دل کے ابال کے بغیر دودن میں ۱۱۶۰ اشعار پر مشتمل بوستاں خیال'' کی تصنیف ممکن نہیں تھی زبان وبیان میں سادگی اور صفائی سے لسانی معیار کی ارتقائی سمت ورفتار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

بہرحال، ان مثنویوں کے علاوہ بھی کچھ مثنویاں قدیم دور سے متعلق ہیں جن پر تفصیل کے ساتھ کوئی بیان کہیں نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ ان میں کچھ تو نایاب ہیں اور کچھ کمیاب۔ کچھ کے صرف نام ہی سامنے آئے ہیں۔

ان میں سے کچھ مثنویاں ایسی بھی ہیں جن کی تاریخی اورلسانی اہمیت ہے۔ ان پر تاریخی، تمدنی، جغرافیائی اور مذہبی اثرات نمایاں ہیں۔ فنی لحاظ سے ان میں بہت ساری کمزوریاں اور خامیاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر امیؔن کی مثنوی بہرام وحسن بانو، صنعتؔی کی تالیف ''قصہ بے نظیر'' سیوا کا ترجمہ ''روضۃ الشہداء'' مومنؔ کی مثنوی ''اسرار عشق'' ملک خوشنود کی ''ہشت بہشت'' اور ''یوسف زلیخا'' جنیدی کی

''قصہ ابوشحمہ'' اور طبعی کی ''بہرام وگل اندام'' وغیرہ۔

مقیمی کے معاصر امین نے ''بہرام وحسن بانو'' کے عنوان سے مثنوی کی تصنیف کا کام شروع کیا لیکن اسے مکمل نہ کرسکا۔ بعد میں دولت نے اس پورا کیا۔ اس مثنوی میں بہرام اور حسن بانو کے عشق کی داستان پیش کی گئی ہے صنعتی کی مثنوی قصۂ بے نظیر پر مذہبی رنگ گہرا ہے۔ سیوا نے فارسی کی روضۃ الشہداء کا اردو میں ترجمہ کیا۔

مومن نے حضرت سید محمد جونپوری کے ملفوظات پر ''اسرار عشق'' کے نام سے ایک طویل مثنوی قلمبند کی۔ ''محبت نامہ'' یا ''محبت نامہ'' کے عنوان سے حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ نے مثنوی تصنیف کی جو ہیئت کے اعتبار سے صنف مثنوی میں ایک تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اس میں ابیات کی پابندی کے برعکس غزل کے قافیے کی ترتیب رکھی گئی ہے اور ہر دو شعر کے بعد قافیہ تبدیل کردیا گیا ہے۔ امین الدین اعلیٰ کی تمام مثنویوں پر مذہب وتصوف کا رنگ غالب ہے۔ مثنویوں کے نام سے بھی یہ بات ثابت ہے مثلاً رموز السالکین نظم وجوریہ، نظم قربیہ وغیرہ۔

زوال گولکنڈہ کے زمانے کا شاعر فائز، طبعی کا معاصر تھا۔ اس نے قصہ رضوان شاہ وروح افزا نام کی مثنوی گیارہویں صدی، ہجری کے آخری دہے میں لکھی تھی۔ یہ اسی نام کی فارسی کہانی کا منظوم ترجمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل ماخذ فارسی ہے اور کرداروں کے نام بھی اسلامی ہیں لیکن اس قصے کی تمام روایات ہندی کے افسانوی ادب سے ماخوذ ہیں۔ اگرچہ اس مثنوی میں وہ شاعرانہ معنی آفرینی اور لطیف بیان نہیں ہے جو اس دبستان کی خصوصیت ہے پھر بھی تاریخی اعتبار سے یہ مثنوی کے ابتدائی دور کی نشاندہی کرتی ہے۔

عہد قدیم ہی کے مثنوی نگاروں میں شاہ سعد اللہ معروف بہ شاہ عشق علی کا نام آتا ہے۔ ان کی ایک مختصر سی مثنوی حضرت شاہ ارزاں کے شجرۂ نسب سے متعلق پائی جاتی ہے۔ شاہ عشق علی کی وفات کا زمانہ ۱۱۹۹ھ قرار دیا جاتا ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر یہ دو ابیات ملاحظہ ہوں:

بعد حمد ایزد و نعت رسولؐ — کرسعادت مدح حیدر سے حصول
کون حیدر ہے جو شاہ نامدار — انبیا اور اولیاء کا افتخار

شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی کا ذکر بھی قدیم مثنوی نگاروں میں اہمیت کا حامل ہے انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مختصر مثنویاں لکھی ہیں۔ اردو مثنویوں میں نقل افیونی، ہجو نگاری اور نقل کبوتر باز نواب مرشد آباد کے سرکاری کتب خانے اور دیوان جوشش کے نسخہ قاضی عبدالودود میں ملتی ہیں موضوعات ومضامین عنوانات ہی سے ظاہر ہیں ان ہی سے خصوصیات کلام کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عشق اور عاشق کی مثنویاں بھی قدیم مثنویوں میں اپنا الگ انداز رکھتی ہیں حضرت شاہ رکن الدین کا تعلق بارہویں صدی ہجری سے ہے انہوں نے زیادہ تر فارسی میں اشعار کہے ہیں۔

ریختہ میں خاصہ بڑا دیوان غزلوں، رباعیوں اور مثنویوں پر مشتمل ہے مثنوی ''یادگار عشق'' کے چند اشعار سے ان کے فن اور اسلوب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سن اے ساقی تاجدار بہار
سن اے ساقی رونق روزگار

سن اے ساقی رونق افزائے جام
لبالب کر اب جام آئینہ فام
قسم ہے تجھے سایۂ تاک کی
قسم ہے تجھے سینۂ چاک کی
نگاہ مروت کی تجھ کو قسم
شراب محبت کی تجھ کو قسم
شتابی سے بھر جام یاقوت رنگ
کہ چھوٹے اس آئینۂ دل سے زنگ
پلا اس مئے آرزو سوز سے
فراغت ہو مجھ کو شب وروز سے

جناب عاشق یعنی مہاراجہ کلیان سنگھ متخلص بہ عاشق بھی حضرت عشق کے دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ کے بیٹے تھے ان کی مثنوی ''زیبا'' کے ذکر کے بغیر میرے خیال میں قدیم اردو مثنوی کا باب مکمل نہیں ہوسکتا چنانچہ مثنوی زیبا ہی سے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

کہ کہتا ہوں اب میں کہانی نئی
دکھاتا ہوں غم کی نشانی نئی
عجب عشق انگیز ہے داستاں
محبت سے لبریز ہے داستاں
مچا شور بربط کا اور چنگ کا
سماں بندھ گیا راگ اور رنگ کا
اکیلے چھپر کھٹ میں دولھا دولھن
لگاتے تھے آپس میں تازہ لگن

خوش طلعتوں کے جمال جہاں آرا اور حسن جہاں سوز کی منظر کشی اور پیکر تراشی کے کمال میں عاشق کے قلم کی جادوگری دکھائی دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوئی غنچہ لب تھی کوئی گلبدن   کوئی سرو تھی کوئی یاسمن
کوئی لالہ رخسار تھی مست ناز   کوئی نرگسی چشم تھی سحر ساز
کوئی غیرتِ سرو آزاد تھی   غرض رشک گل ہر پری زاد تھی

اردو مثنوی کے ارتقائی سفر میں دور قدیم کی یہ مثنویاں آگے آنے والی منزلوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور ان ہی مثنویوں کی بنیاد پر عہد وسطیٰ اور جدید دور کی مثنویوں کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

بقیہ پریم چند کی تخلیقی عظمت

پریم چند کی یہ کہانی ارذل اور گھناؤنی ذہنیت کی کامل عکاسی کرتی ہے۔ اس کہانی سے قاری کو جو سبق ملتا ہے، اسی کے اثرات بہت گہرے اور دیرپا ہیں۔ ان دونوں کہانیوں کے ذریعے پریم چند نے اپنے قاری کو جو ذہنی وفکری غذا دی ہے یا اس کی سوچ کو جو بلند رخ دینے کی کوشش کی ہے، وہ بہت واضح اور نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ منشی پریم چند ہندوستان میں اتحاد باہمی کے علم بردار تھے۔ اپنی کہانیوں میں وہ ہمارے ملک کی سماجی اور تہذیبی روایات سے پوری طرح جڑے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے افسانے، کہانیاں اور ناول ہندوستان کی صدیوں کی مشترکہ تہذیب وثقافت کا خلاصہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہندوستان کی زمینی سچائیاں ملتی ہیں۔ وہ ایک سچے فن کار اور مخلص ہندوستانی تھے۔ وہ ہمارے ان معدودے چند کہانی کاروں میں ہیں، جنہوں نے اردو افسانے کی سمت ورفتار متعین کی ہے اور آنے والی نسل اس پر مسلسل چلتی اور تہذیب وثقافت، اتحاد واتفاق اور حب وطن کی روشنی بکھیرتی رہے گی۔ ☆☆☆

اسلامی ادب میں افسانہ نگاری

مسائل اور امکانات

شاہ اجمل فاروق ندوی
استاد جامعہ خیر النساء، دہلی

مولانا عبدا لماجد دریابادی نے افسانے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''افسانہ نام ہے ایک ممکن زندگی کی حکایتی مصوری کا۔''

''ممکن زندگی کی حکایتی مصوری'' کے متعلق بہت کچھ کہاجاسکتا ہے۔اس اجمال کی تفصیل میں صفحات کے صفحات سیاہ کئے جاسکتے ہیں۔اس مختصرسی تعریف سے بے شمارنکات اور گوشے نکالے جاسکتے ہیں۔لیکن زبانی یاذہنی طور پراس سلسلے میں کچھ بولنایاسوچنا جس قدرآسان ہے،عملی طور پر برتنااس سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔اسی لئے پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہاتھا:

''افسانہ چاول پرقل هوالله لکھنے کافن ہے۔کوزے میں جمنا کاتماشا کرنے کاہنر ہے۔فن افسانہ وہ فن مجید ہے جس کے وجود سے صحائف آسمانی آراستہ ہیں۔''(نیادورافسانہ نمبر ازگوپی چندنارنگ،ص۳۴)

درحقیقت افسانہ،نثری ادب کی سب سے مقبول اور نازک صنف ہے۔یہ افسانے کی مقبولیت ہی تو ہے کہ اردو زبان میں جس طرح شاعری میں تجریدیت،رمزیت،ترقی پسندی،جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مختلف تجربے کئے جاتے رہے ہیں ، اُسی طرح افسانہ بھی مختلف افکار ونظریات کے تجربات کی جولان گاہ بنتارہا ہے۔الگ الگ نظریات اورمکاتب فکر کے ادباء وناقدین نے اس کو اپنے اپنے فکراورنظریے کے مطابق برتنے کی دعوت دی ہے۔اس فکری کھینچ تان کی اصل وجہ یہی ہے کہ افسانہ نثری ادب کی مقبول ترین اور موٴثر ترین صنف ہے۔اس کے ذریعے بہ آسانی اپنے افکار ونظریات کی ترسیل وتبلیغ کی جاسکتی ہے۔لیکن اردوافسانے کی گذشتہ سوسالہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے کسی ایک مخصوص دائرۂ فکر میں قید ہونا گوارانہیں کیا۔مختلف تجربات سے گزرنے کے باوجود آج بھی اس میں بے پناہ وسعت موجود ہے۔مختلف تحریکات کو اپنے اندرسمیٹنے کے باوجوداس کادامن لامحدود وسعتوں کا حامل ہے اور ہر نئے دور کاساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتاہے۔

ادب اسلامی کی تحریک اب ایک عالمی تحریک بن چکی ہے ۔ بے شمار سیاسی ومعاشرتی مسائل اور رکاوٹوں کے باوجوداسلامی ادب کانعرہ پوری ادبی دنیا کو اپنی جانب متوجہ کرچکاہے۔البتہ اسلامی ادب کے متعدد گوشے ایسے

بھی ہیں، جن کے متعلق اب تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے مشہور اسلامی ادیب و ناقد ڈاکٹر ابن فرید نے لکھا تھا:

''یہ ادبی تحریک ابھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکی ہے کہ دوسری ادبی تحریکوں کا مقابلہ سرمایۂ ادب اور معیار ادب کے لحاظ سے کر سکے۔ ابھی اس کے بہت سے پہلو خام ہیں۔ ان کی ہیئت اور شکل متعین نہیں ہے۔ وہ مٹی جس سے یہ سبو تیار ہو رہا ہے، پختہ نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باجود اپنے وجود کا احساس دلا چکی ہے۔ اس کے نظریے اور امکانات پر اس کے حلقے میں ہی نہیں بلکہ اس کے باہر بھی خیال آرائیاں ہونے لگی ہیں۔'' (ادب دادطلب، ص ۹۵)

غیر افسانوی ادب (Non Fictional Literature) کے اسلامی ذخیرے کے متعلق مذکورہ بالا خیالات کو درست نہیں کہا جا سکتا۔ اسلئے کہ اس میدان میں اسلامی ادب کے پاس شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، ابوالحسن ندوی، عبدالماجد دریابادی، عامر عثمانی، ماہر القادری، محمد حسن عسکری اور عبدالمغنی جیسے متعدد اہم ادباء و ناقدین موجود ہیں، جن کے مقام اور ادبی خدمات کا اعتراف پوری دنیائے ادب نے کیا ہے۔ البتہ افسانوی ادب (Fictional Literature) کے تناظر میں ابن فرید کی مذکورہ رائے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میدان میں اسلامی ادب کے پالے میں سید اسعد گیلانی، ماہر القادری، ابن فرید، مائل خیرآبادی، م نسیم، عائشہ صدیقی، سلمہ یاسمین، نجمی اور ہاجرہ مسرور جیسے چند نام ہیں، جنھیں بہ آسانی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ افسانے کے میدان میں اسلامی ادب کی اس غیر معیاری صورت حال کے پیش نظر اُن مسائل کا ادراک ضروری ہے، جن کے حل کے ذریعے ادب اسلامی کے اس خلا کو پُر کیا جا سکے اور اِس مؤثر ترین و مقبول ترین صنفِ ادب سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر معاشرے کے اندر مقصدیت پیدا کی جا سکے اور انسان کو انسانیت کی راہ پر لگایا جا سکے۔

اردو افسانہ نگاری نے مغرب کے افسانوی ادب سے بہت استفادہ کیا۔ ہیئت و ساخت، اسلوب و انداز کے اصول در آمد کئے ہیں۔ حتیٰ کہ مرکزی خیال (Theme) اور موضوعات و افکار میں بھی مغرب سے استفادہ کر کے خود کو ایک مستقل شکل دے لی ہے۔ بلکہ کچھ مشہور اردو و عربی افسانہ نگاروں نے تو مغربی مفکرین کی غیر انسانی اور گم راہ کن فکر کو اختیار کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ اس ذیل میں اردو افسانے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے فرائڈ کے گھناؤنے جنسی نظریات کا اثر قبول کر کے، اس کی فکر کو اپنے افسانوں میں بھی جگہ دی۔ اس کے علاوہ یورپی مفکرین کی مذہب بے زار اور خدا بے زار فکر کے بھرپور اثرات بھی کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ جب کہ عربی افسانہ نگاروں میں احسان عبد القدوس، یوسف ادریس، طٰہٰ حسین، نجیب محفوظ اور یوسف سباعی مغرب کے جنسیات آمیز اور خدا بے زار فکر کی بڑے زور و شور کے ساتھ اشاعت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال میں اسلامی افسانہ نگار کے لئے سب سے

بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مغرب کے افسانوی ادب سے کس طرح استفادہ کرے؟ ظاہر سی بات ہے کہ جب عام اردو افسانے نے مغرب سے استفادہ کرکے اپنے آپ کو فن کی بلندی تک پہنچایا ہے تو اسلامی افسانے کو بھی اُسی معیار کا افسانوی ادب پیش کرنے کیلئے مغرب کے افسانوی ادب سے استفادہ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ اسلامی افسانہ نگار شترِ بے مہار کی طرح مغرب کے افسانوی یا ادبی جنگل میں آزادانہ نہیں گھوم سکتا۔ اُسے تو ایک مہذب انسان کی طرح کھرے کھوٹے کو پرکھنا ہوگا۔ "خُذ ماصفا ودع ما کدِر" پر عمل کرتے ہوئے اپنے لئے نفع بخش اصول وضوابط کو اخذ کرکے ایک نئی راہ متعین کرنی ہوگی۔ لہٰذا اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے مغرب کے افسانوی ادب کو کنگھال کر اُس سے کچھ رہ نما اصول وضوابط کا تعین اسلامی افسانہ نگاری کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے حل کے بغیر اسلامی ادب میں ایسی افسانہ نگاری کی امید نہیں کی جاسکتی، جیسی افسانہ نگاری اردو ادب کی دوسری تحریکات میں ہوتی رہی ہے۔

مغربی افسانے کے عمیق جائزے اور چھان پھٹک سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس کے کم زور پہلوؤں پر بھی ہماری نظر ہوگی اور اس گم راہ ادب کے مقابلے میں صالح اور پاکیزہ ادب کی تخلیق بھی آسان ہو جائے گی۔

اسلامی ادب ایک رہنما اور صالح ادب ہے۔ اس کا مقصد معاشرے کی رہنمائی اور آدمیت کی ترویج واشاعت ہے۔ اس لئے اس کی افسانہ نگاری کا مقصد بھی وقتی لطف اندوزی اور عارضی خوشی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے افسانے کا مقصد تعمیر واصلاح ہونا چاہئے۔ افسانوی ادب میں مقصدیت پیدا کرنے کا یہ مرحلہ انتہائی نازک ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر افسانے کا پلاٹ، کلائمکس یا خاتمہ خالص نصیحت آمیز اور اصلاح پر مشتمل ہوا تو اس سے افسانے کی نزاکت ولطافت مجروح ہو جائے گی اور قاری اس افسانے سے اکتا کر نہ صرف یہ کہ نفع حاصل نہیں کرسکے گا بلکہ تنفر بھی ہو جائے گا۔

لہٰذا اسلامی ادب سے وابستہ افسانہ نگار کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس کے پاس افسانہ تخلیق کرنے کے ایسے اصول وضوابط موجود نہیں ہیں، جن کی رعایت کرتے ہوئے وہ افسانے کی فنی نزاکت کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھ سکے اور اس میں صالح فکر کے عناصر بھی داخل کرسکے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی ادبؔ کے علم بردار اس اہم ضرورت کی طرف فوری توجہ دیں اور دوسری تحریکات کے افسانوی ادب کو بھی سامنے رکھتے ہوئے اپنے لئے اُن حدود کا تعین کریں، جن کی پاس داری ہر افسانہ نگار کیلئے لازمی قرار

> .....اسلامی افسانہ نگار کے لیے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی افسانہ نگار یا کچھ ایسے منتخب افسانے نہیں ہیں، جن کو اسلامی ادب کے ناقدین نے ideal قرار دیا ہو۔ تاکہ ان کو پڑھ کر ایک نیا لکھنے والا روشنی حاصل کرسکے اور اس کو اپنے لئے نمونہ قرار دے کر افسانے کی دنیا میں اپنا سفر آگے بڑھا سکے۔ اس مسئلے کے حل کیلئے افسانوی تنقید کی ضرورت پڑے گی۔ تاکہ اسلامی ادب میں افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کو اسلامی ادب کے لحاظ سے مکمل قرار دیا جاسکے.....

دی جائے۔ تاکہ اس کا تخلیق کردہ افسانہ وعظ وتقریر کی شکل اختیار کرنے سے بچ سکے اور فن کے لحاظ سے بھی پوری طرح مکمل ہو۔ اسلامی ادب میں اردو افسانہ نگاری کے اس اہم مسئلہ کے حل میں عربی افسانوی ادب سے بھی خاصی مدد مل سکتی ہے۔ اسلامی افسانہ نگاری کے ان حدود کا تعین یقیناً ایک دشوار گزار مرحلہ ہوگا، جو ایک دو مجلسوں میں سر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس مرحلے کو سر کئے بغیر فنی اور فکری لحاظ سے ایک مکمل افسانے کی امید رکھنا بھی غلط ہوگا۔ افسانے کے فنی محاسن کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں مقصدیت اور اصلاح وتعمیر کے عنصر کو شامل کرنا، پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر تراشنے کے مترادف ہوگا۔ اسلامی ادب کے علم برداراں کے پاس اس نازک مرحلے کی انجام دہی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

اسلامی افسانہ نگار کے لیے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی افسانہ نگار یا کچھ ایسے منتخب افسانے نہیں ہیں، جن کو اسلامی ادب کے ناقدین نے Ideal قرار دیا ہو۔ تاکہ ان کو پڑھ کر ایک نیا لکھنے والا روشنی حاصل کرسکے اور اس کو اپنے لئے نمونہ قرار دے کر افسانے کی دنیا میں اپنا سفر آگے بڑھا سکے۔ اس مسئلے کے حل کیلئے افسانوی تنقید کی ضرورت پڑے گی۔ تاکہ اسلامی ادب میں افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کو اسلامی ادب کے لحاظ سے مکمل قرار دیا جاسکے۔ البتہ تیسرے مسئلے کو حل کرنے کے لئے پہلے اور دوسرے مسئلوں کا حل ناگزیر ہوگا۔ اس لئے کہ جب اسلامی افسانے کے اصول وحدود کا تعین ہوگا تو انہی کے تناظر میں افسانوں پر تنقید کی جاسکے گی اور اسلامی افسانوی تنقید وجود میں آسکے گی۔ ان تین مسائل کے علاوہ اسلامی افسانہ نگاری کو اور بھی مقصود مسائل درپیش ہیں۔ لیکن ان میں یہ تین مسائل مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تین مسائل کے حل کے بعد ہی وقیع اسلامی افسانے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہ اسلامی ادب کا ایسا خلا ہے، جس کا پُر کرنا فوراً ضروری ہے۔ اس لئے کہ افسانے کی معنویت میں زمانے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے اور اسلامی ادب اب تک اس میدان میں قابل ذکر کام نہیں کرسکا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

''اردو افسانہ ایک دوراہے پر آگیا ہے۔ ایک طرف رومانی رویہ، زندگی کی اکہری تعبیر اور فارمولا زدہ افسانہ رد ہوچکا ہے، تو دوسری طرف علامتی تجریدی افسانہ بھی تمام ضرورتوں کا جواب پیدا نہیں کرسکا۔ اردو افسانے کی پشت پر پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کی قابل قدر میراث ہے، لیکن نئے عہد کی پیچیدگیاں، انسانی اقدار کا زوال، عالمی طاقتوں کی جنگ زرگری نیز تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال، پس ماندگی، افلاس، جہالت اور بے روزگاری ایسے بھیانک مسائل ہیں، جو نئے اظہاری پیرایوں کا تقاضا کرتے ہیں''۔ (نیا اردو افسانہ، ص ۸)

ایسے وقت میں جبکہ نارنگ صاحب کے بقول اردو افسانہ ایک دوراہے پر آگیا ہے اور افسانوی ادب میں مختلف تجربات ناکام بھی ہوچکے ہیں، اسلامی ادب کے علم برداروں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ آگے آئیں، زمانے کی ضرورت کو سمجھیں اور اپنے افسانوی ادب میں موجود خلا کو پُر کرکے ایک ایسا معیاری اردو افسانوی ادب تخلیق کرنے کی راہ ہموار کریں جو زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرسکے اور معاشرے کی تعمیر وتشکیل کا فریضہ انجام دے سکے۔ ☆☆☆

اردو میں قصہ نگاری کی روایت

سجاد احمد ندوی
خطیب جمعہ مسجد عبدالحئی، اکزبیشن روڈ، پٹنہ

اردو میں قصہ نگاری کا باضابطہ آغاز فورٹ ولیم کالج کی مساعی سے ہوا، جس کے نتیجہ میں اردو کی معروف داستان ''باغ وبہار'' منظر ادب پر نمودار ہوئی۔ باغ وبہار کے علاوہ حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی اور آرائش محفل نے بھی اپنے وجود کو منوایا۔ لیکن فنی اور جمالیاتی لحاظ سے میر امن کے قصہ چہار درویش (باغ وبہار) کو پہلا مقام حاصل ہے۔ تحسین کی نوطرز مرصع اپنے طرز کی ایک مشہور داستان تھی جو باغ وبہار سے قبل لکھی گئی تھی لیکن بے مثل قصہ نگاری کے اعتبار سے باغ وبہار کو نوطرز مرصع پر فوقیت حاصل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مختلف اخلاقی، سماجی، اصلاحی اور تعمیری تحریکوں نے جنم لیا۔ اصلاحی اور قومی خدمات کے لحاظ سے سرسید کی علی گڑھ تحریک نے قصہ نگاری کی ایک جدید سنگ بنیاد رکھی، جس نے قومی وملی اور اجتماعی شعور کو بیدار کیا۔ اس عمل میں سرسید کے رفقاء کار بھی ان کے شریک کار رہے۔

اردو میں قصہ نگاری کا آغاز ناول نگاری کی شکل میں ڈپٹی نذیر احمد نے کیا۔ ان کا پہلا ناول مرأۃ العروس بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے منظر عام پر آیا تھا۔

قصہ نگاری کی روایت کو مولانا راشد الخیری نے بھی آگے بڑھایا اور عورتوں کے مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ ان کا مقصد طبقۂ نسواں کی اصلاحی اور تبلیغی تحریک کو آگے بڑھانا تھا۔ انہوں نے اس موضوع کو اپنا ہدف بنا کر متعدد ناول لکھے۔ انہوں نے عورتوں پر سماج میں ہونے والے مظالم کو زندگی کا نازک ترین المیہ بنا کر پیش کیا۔

قصہ نگاری ہمیشہ ہر دور میں انسان کی ضرورت بن کر رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان نفسانی خواہشوں کا پتلا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ناآسودہ اور تشنہ لب خواہشوں کا ایک جنگل ہے، جو ارمان، آرزو، تمنا، خواہش، شوق اور ہوس کی شکل میں مختلف صورت وپیکر بن کر انسان کی عملی زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔ انسان جب خود اپنی خواہشوں کی تکمیل نہیں کر پاتا تب وہ اس آپ بیتی کو جگ بیتی کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اور انسان کی یہی ضرورت قصہ، کہانی، داستان، ناول، فلم اور ڈرامہ کی شکل میں اس کی تسکین کا سامان مہیا کرتی ہے۔ قصے اور کہانی کے کرداروں میں انسان اپنی ذات، اپنی خواہشوں، اپنی کامیابیوں اور اپنی ناکامیوں کو بامراد ہوتا ہوا دیکھ کر قلب حزیں کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔

ابتدائی دور میں قصہ نگاری کا مقصد محض تفریح طبع تھا، اسلئے کہ انسان کے مسائل حیات کی فہرست بھی ویسی طویل نہیں ہوئی تھی جیسی کہ آج ہے۔ لیکن جوں جوں زندگی کے لمحات پیچیدگی اختیار کرتے گئے اور انسان مسائل کے انبار تلے دبتا گیا قصہ نگاری کے طرز وانداز میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں۔

دور جدید میں قصہ نگاری محض تفریح طبع کا سامان نہیں رہ گئی بلکہ مسائل حیات کی ترجمان بن گئی۔ اس وقت دنیا میں جو بے چینی پائی جاتی ہے، ظلم وستم کا جو بازار گرم ہے، قتل وغارت گری کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں، قدروں کی جو ناقدری کی جارہی ہے، جذبات کا جو مذاق اڑایا جارہا ہے، نازک احساسات کو مشین کے پہیوں تلے کچلا اور مسلا جارہا ہے، انسانی رشتے پامال ہو رہے ہیں، تعلقات میں تلخیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں اور انسانیت شرمندہ وشرمسار ہو رہی ہے، ان سب معاملات پر آج کا انسان کچھ کہنا چاہتا ہے اور کچھ سننا چاہتا ہے۔ لیکن بیان کی قدرت سبھوں کے پاس نہیں ہوتی چنانچہ قصوں اور کہانیوں میں جب یہ چیزیں پیش کی جاتی ہیں تو قاری محسوس کرتا ہے کہ کسی نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔

قصہ نگاری کے لئے یوں تو کہانی، ناول اور افسانے کے پیرائے کافی مقبول ہوئے، لیکن سب سے زیادہ جس صنف نے اپنا رنگ جمایا وہ افسانے ہی تھے۔ اور پھر جدیدیت یا جدت طرازی کا دور شروع ہوا۔ تخلیق کاروں نے قصہ نگاری کے نام پر وہ وہ قلابازیاں کھائیں اور ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ قاری ششدر اور حیران رہ گیا کہ اس معرکہ آرائی میں قصہ نگاری کہاں چلی گئی۔ تخلیقات چیستاں بن کر رہ گئیں اور قاری قصہ کی دلچسپی سے محروم ہو کر مایوسی کا شکار ہونے لگا۔

قصہ نگاری کے بہتیرے پیرائے ہیں جن میں یہ فن اپنی جلوہ سامانی دکھاتا ہے۔ انسان کان کے ساتھ آنکھیں بھی رکھتا ہے۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ جو کچھ سنتا ہے جانتا ہے اور محسوس کرتا ہے اسے دیکھ بھی لے، سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے قصہ سنانے کے فن کو قصہ دکھانے کے فن میں تبدیل کر دیا۔ انسان کی فطری خواہش کا تذکرہ علامہ اقبال نے یوں کیا ہے:

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

چنانچہ دور جدید کے انسان کو جب قصہ سننے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کو بھی ملنے لگا تو اس کی دلچسپی قصہ نگاری سے دوچند ہوگئی۔ تھیئٹر، ڈرامہ، سنیما اور پھر ٹیلی ویژن پہلے تو امیروں کے شوق اور دلچسپی کا سامان بنے لیکن رفتہ رفتہ یہ عوام کی ضرورت بنتے گئے اور اب ہر وہ انسان جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہے اور قصہ پڑھ نہیں سکتا ہے وہ بھی قصوں کو دیکھ کر ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

قصہ نگاری کی روایت قدیم ہے اور اب دور جدید میں اس نے جدت پسندی کا جامہ پہن کر اپنا مقام اور مرتبہ پہلے سے زیادہ مستحکم اور مضبوط بنا لیا ہے۔ انسان پہلے بھی اس سے بے نیاز نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دور جدید میں قصہ نگاری زندگی کی ایک بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ وہ عمر دراز لوگ جن کی اولادیں انہیں غم تنہائی میں مبتلا کر کے پردیس سدھار چکے ہیں ان کے درد جدائی کا واحد حل ٹیلی ویژن ہے اور اس کے رنگا رنگ تفریحی پروگرام۔ ☆☆☆

مکرمی ومحترمی جناب .... زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔
عالمی رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر کی طرف سے اس کا دوروزہ سالانہ (۳۰واں) مذاکرۂ علمی ضلع سہارنپور میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملحق ادارہ ''المعہد الاسلامی'' مانک مئو ضلع سہارنپور (یوپی) کے تعاون سے احاطۂ المعہد الاسلامی میں مؤرخہ ۱۴-۱۵ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ۰۷-۰۸ر اپریل ۲۰۱۲ء بروز شنبہ ویکشنبہ منعقد کیا جانا طے کیا گیا ہے، جس کا موضوع ہے:

''ادبِ نبوی کا تربیتی پہلو''

مذاکرۂ علمی کی صدارت عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر اور اس کے شعبۂ برصغیر کے صدر جناب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی فرمائیں گے۔ مجلس استقبالیہ کے صدر جناب مولانا محمد ناظم صاحب ندوی رئیس المعہد الاسلامی ہوں گے۔ مذاکرۂ علمی میں آپ کی شرکت ہمارے لیے باعث مسرت ہوگی۔
مقالہ نگار حضرات اپنی شرکت کے ارادے اور مقالے کے عنوان سے صدر دفتر اور مقام انعقاد دونوں کو یکم رمارچ ۲۰۱۲ء تک مطلع کرنے کی زحمت کریں تاکہ مقالات کی ترتیب وتنسیق میں سہولت ہو۔ مذاکرۂ علمی کے دوران قیام وطعام کی ذمہ داری منتظمین کی ہوگی۔
نوٹ: مندوب حضرات سہارنپور اسٹیشن پر اتریں، اور اپنی آمد کی تفصیل سے مقامی منتظمین کو پہلے سے مطلع کردیں تاکہ منتظمین اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود رہیں۔ بطور نمونہ ذیلی عناوین کی ایک مختصر فہرست منسلک ہے۔ والسلام

داعی
محمد واضح رشید حسنی ندوی
سکریٹری عالمی رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

رابطہ کا مستقل پتہ

دفتر رابطہ ادب اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳ ندوۃ العلماء، لکھنؤ-۲۲۶۰۰۷ (یوپی)، فون وفیکس: 0522-2741221 موبائل نمبر: 9450644216

مقام انعقاد کا پتہ

مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، رئیس المعہد الاسلامی، مانک مئو، سہارنپور، موبائل: 09012154460 - 09412435015

موضوع: ادبِ نبوی کا تربیتی پہلو

ذیلی عناوین:

(۱)-حدیث شریف کی تربیتی اہمیت۔ (۲)-حدیث میں وارد قصوں کی خصوصیت۔ (۳)-احادیث نبویہ کا دعوتی پہلو۔ (۴)-موجودہ عہد میں حدیث شریف کے قصوں کی معنویت۔ (۵)-احادیث نبویہ میں عقیدۂ توحید ورسالت کا تربیتی کردار۔ (۶)-حدیث شریف کے قصوں میں ترسیل دعوت کا انداز۔ (۷)-کردار سازی کے سلسلے میں احادیث نبویہ کا کردار۔ (۸)-اساطیری ادب وافسانے اور احادیثِ نبویہ کا تقابلی مطالعہ۔ (۹)-غار والوں کے قصے کی تربیتی خصوصیت۔ (۱۰)-اردو افسانہ نگاری پر حدیث شریف کے حکایتی اسلوب کا اثر۔ (۱۱)-حدیث شریف میں انسانی نفسیات کی عکاسی۔ (۱۲)-حدیث شریف کے قصوں میں کردار نگاری۔ (۱۳)-احادیث نبویہ کے قصے: ایک ادبی جائزہ۔ (۱۴)-احادیث نبویہ میں انسانی عظمت اور بلندیٔ کردار کے نمونے۔ (۱۵)-احادیث نبویہ میں نسوانی احساسات وجذبات کی جھلکیاں۔ (۱۶)-احادیث نبویہ میں مکالمہ نگاری/ جذبات نگاری/ منظر نگاری۔

افتتاحية العدد

(سعادة الشيخ الجليل)
السيد محمد الرابع الحسني الندوي

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على خاتم النبيين محمد صلى الله عليه وسلم .

وبعد فالإنسان يحاكي رجال بيئته، و أوساطه العلمية منذ حداثة سنه كما يراهم، ويمشي على منوالهم، فالذى يكون في البادية يكون مثل أصحابها، والذى يكون في البلد يختار المدنية وأساليبها، فإذا تدبرنا في هذا الأمرعلى مستوى البيوت عرفنا أن الطفل يتأثر باتجاهات ونزعات الأبوين وذوى القربى بدون شعور، ويكون مثلهم في الأفكار وأساليب الحياة .

فليعلم أن البيئة تكون ذريعة لتكوين طبيعة الإنسان وذهنه واتجاهه إلى وجهة معينة، هذا ما يحصل في وقت خاص في كل زمن، و لكن اللغة والكلام اللذين أكرم الله بهما الإنسان يستمر بهما عمل تأثير الإنسان في الآخرين إلى أجيال آتية، وتكون الثروة الأدبية مؤثرة في هذا المجال، فإنها تعرض في أسلوب شيق، وطراز جديد، ويكون نطاق هذا التأثير واسعاً بالروايات والقصص القصيرة، ولايزال البارعون في الشعر والنثر يقومون بهذا الواجب، واستمر هذا العمل في العرب في الزمن الجاهلي بالشعر، وقد أثر العرب تارة بأشعارهم في الأسر والطبقات بكاملها .

إن النثر يكون سهلاً بالنسبة إلى الشعر، ويحمل قيمة كبيرة حينما يقدم في قالب أدبي، وهذا الأمر يتحقق اليوم في مجال النثر الكلامي بفن الخطابة، و في مجال النثر الكتابي بالروايات والقصص القصيرة، فأعدت بذلك روايات وقصص مؤثرة، وأخذت من القراء كل مأخذ .

إن الأدب سواء يمثل الحيلة الحضارية للإنسان أوكان حراً طليقاً، غير متقيد بقيود، يسحر الناس بميزاته الخاصة، وقد أدت في العصر الراهن الروايات والقصص دوراً كبيراً بوجه خاص، فلو جعلت هذه الصفة القوية للغة والأدب تتحلى بالخصائص الإسلامية، لكانا خير ذريعة لخدمة المجتمع الإنسانى من حيث المحاسن الإنسانية، لأن الإسلام مثلما يلفت وجهة الإنسان إلى الحياة الحضارية، لايمكن من أية وجهة نظر أخرى بغيره بناء السيرة المثالية مثله .

نظراً إلى ذلك قررت رابطة الأدب الإسلامي العالمية عقد ندوة حول أدب القصص والحكايات، فقدمت فيها مقالات جيدة، وقد طبع تقرير هذه الندوة في العدد الماضى لمجلة كاروان أدب، وتقدم الآن في هذا العدد المقالات المختارة لهذه الندوة، أرجو أن القراء الكرام سيدرسونها بشوق ورغبة .

القصة باللغة الأردية

سعادة الشيخ الجليل محمد الرابع الحسني الندوي

(هذه خطبة رئاسية لسعادة العلامة الشيخ السيد محمد الرابع الحسنى الندوي ألقاها بمناسبة الندوة الأدبية المنطقية لرابطة الأدب الإسلامي لشبه القارة الهندية، المنعقدة في مؤسسة الإمارة الشرعية بفلواري، بتنه عاصمة ولاية بيهار في ٢٣ دسمبر عام ٢٠١٠ م يوم الخميس).

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، وعلى آله و صحبه الغر الميامين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد:

فإن مكتب رابطة الأدب الإسلامي لشبه القارة الهندية والبلدان الشرقية يعقد كل سنة ندوة يشترك فيها المندوبون من الهند وخارجها و يقدمون فيها مقالات وبحوثا حول الموضوع المحدد، وقد عقدت بحمد الله وفضله إلى الآن ٢٥/ ندوة أدبية تقريباً في مدن الهند المختلفة، وهي دهلي، وممبائى، وفونه، وبوفال، وحيدرآباد، وبنجلور، و أورنغ آباد، و جمبوسر، وبنارس، و كولكاته، ورانتشي، وميرته، وأعظم جراه، ورائے بريلي، وإله آباد، وغازيفوروغيرها، وتعقد هذه الندوة مرة أخرى في مدينة بتنه، وكان سماحة العلامة الشيخ السيد أبو الحسن علي الحسني الندوي رحمه الله تعالى الذي كان رئيس رابطة الأدب الإسلامي العالمية، يشترك في هذه الندوات باستمرار، قبل وفاته عام ١٩٩٩م، ولا يزال يحدد لكل ندوة موضوع يحمل جدة وطرافة، وذلك من ناحية الأدب والإسلام، مثل: الحمد والمناجلة والدعاء، والمزايا الفنية للحديث النبوي، والمديح النبوي: استعراض تاريخي وعلمي وخصائصه، وأدب التراجم، والخطبات والمواعظ في ضوء الأدب، ومساهمة الأدب في الصحوة الإسلامية وتأثير الأدب الإسلامي والخلقي في بناء السيرة المثالية وخدمات العلماء في تنمية اللغة الأردية والأدب، والإعجاز البياني للقرآن الكريم، واستعراض أدبي لكتب السيرة النبوية، و مآثر الشيخ المحدث محمد طاهر الفتني وعلماء غجرات الأدبية والعلمية و غيرها.

قد عين لهذه الندوة: استعراض فن القصة باللغة الأردية، وسيذكر فيها الجانب الإسلامي للقصة و يركز عليه، أرجو أن المقالات و البحوث النافعة ستقدم فيها، وهناك في مدينة بتنة عدة شخصيات مؤقرة لها شغف بالموضع، و يساهم فيها كثير من العلماء من خارج ولاية

بهار، و سيكون هذا الاجتماع إن شاء الله اجتماعا مفيدا، و يأتي أمامنا بمعلومات مفيدة وتحقيقية في هذا الجانب.

أيها الحفل الحضور! نال شبه القارة الهندية اللغة الأرديةكلغة تحمل خصائص جامعة ومتنوعة، و يوجد في تكوينها آثار اللغات المنطوقة بين الطبقة الحاكمة وا لعلماء والأمراء ثم العامة من الناس والطبقة المتوسطة في العلم، وكان فيها أثر.

اللغةالعربية بسبب العلماء، واللغة العربية تزخر بالمواد الدينية والإسلامية، وكان لغة الطبقة الحاكمة والأمراء والمكاتب فارسية فنالت اللغة الأردية من مساهمتهم مصطلحاتها وتعبيراتها، وكان أدب الفارسية شائعا في الطبقة المتعلمة، فدخلت مزايا أدبية في اللغة الأردية من جرائها، ثم أدخل فيها مراعاة للعوام و حاجة مخاطبتهم مفردات اللغة الهندية، وكان بسبب تدخل الإنجليز أثر للغة الإنجليزية ومصطلحاتها فيها، فكانت اللغة الأردية جامعة للخصائص المتنوعة للبلاد، فتوافر لها الجمال والحسن من جانبي الحياة العامة والخاصة، لبلوغها إلى أوج الكمال، واجتمعت فيها ثروات دينية وثقافية للإسلام، لانضمام اللغتين الفارسية والعربية إليها.

ففي هذا العهد حينما لا تجد اللغة الأردية الدارجة في هذه البلاد الكبيرة، لغة العوام والخواص تشجيعا لائقا بها من الطبقة الحاكمة، تعود المسئولية على كواهل أهل اللغة أن يبذلوا جهودا مفيدة بمشيئة الله تعالى لصيانة هذه اللغة المملوءة بالذخائر، وتعقد برامج تقوي بقاء ووجود هذه اللغة وفعالياتها، فهذه الندوة أيضا سلسلة مهمة منها.

أيها المستمعون الكرام! إن القصة في اللغة الأردية تبتدئ من الرواية، ثم أضيفت إليها القصة القصيرة، وإن القصة القصيرة تكون صغيرة من الرواية، فيكثر مطالعتها من الأصناف الأخرى، وإن القصة والرواية كلتا هما تغذيان القراء بالغذاء المشبع و تهدئ عواطفهم، وتكون مبعث الراحة الذهنية، و تكشف جانبا من جوانب الحياة، وتكون ذريعة للحصول على شيء نفسي لازم، تلوح هذه الجوانب كلها في روايات الأستاذين عبد الحليم شرر ونذير أحمد.

هناك أدوار لترقية القصص القصيرة، فقد سرى إليها تعديل بتغير الأحوال، ويوجد فرق في الحالات النفسية والكيفيات الاجتماعية لأهل اللغة، نظرا إلى الأساليب والطرق المختلفة عامة، فإن تأريخ القصص القصيرة والروايات باللغة الأردية الذي يمتد إلى قرن ونصف أو أقل من ذلك، يوضح ما يوجد فيه من استعراض كامل للظروف الاجتماعية للبلاد وتفاصيل الشئون ذات الحساسية الفردية الجماعية، إن الحيلة الإنسانية تحمل جانبي الخير والشر، فالاطلاع عليهما يكون مساعدا في معرفة وسائل تكميل الحا جيات الإنسانية والتقدم إلى الأمام، ويلزم على الإنسان معرفة الحيلة الاجتماعية التي توجد فيها الجوانب

السياسية والخلقية والعائلية ؛ وتكون ذريعة القصص أنفع وأجدى للقصة، إن الله تعالى وهب الإنسان موهبة المحاكاة ومقارنة حالاته من أحوال الآخرين ، وتكون هذه الموهبة ذريعة حسنة لإصلاحه و ازدهاره ، ويكون دور الروايات والقصص القصيرة مؤثرا إلى حد كبير . إن الهند قد مازالت مصابة بالفساد العام زمن الاستعمار وبعده ، وكان بين الأغنياء والفقراء فرق كبير ، وكان هناك اتجاه الحيا ة للطبقات المتضررة بالاختلاف والانتهازيين و فاسدي الأخلاق العائشين تحت ضغوط التقاليد والروايات الاجتماعية ، ، فتنبه له شعور الرجال الذين يحملون ذهنا صافيا بناء، واختار أصحاب الأقلام الذين لهم ذوق أدبي طريق كتابة الروايات لا ستخدام مواهبهم ، ووجهوا إلى القوم رسالتهم، واستمرت هذه السلسلة مع مرور الزمن ، ثم إن ما أثر ت سلطة الانجليز من نا حية التعليم وأسلوب الخطاب الأدبي ، وجه ذلك إلى الصبغ بالصبغة الأدبية الجديدة ، ثم ما وردت النزعات من المعسكر الشيوعي أفاض على الأدب لونا جديدا ، تركيزا على الصراع بين الغنى والفقير ، لكن هذا اللون ذهب بأصحابه إلى المادية البحتة والمصلحة الدنيوية والاتجاه المخالف للدين ، فحاول لمقاومتها الرجال المتحمسون للدين ، الذين اختاروا فن القصة أيضا ، وتستمر هذه السلسة إلى الآ ن، فإن ما جاء من تغيرات و فرق تدريجيا في مجال القصة ، يسلط عليها المقالات التي ستقدم في هذه الندوة .

أيها المستمعون : إن الأدب إذا استعمل للمتعة واللذة كا ن ذلك بمثابة التمتع المؤقت بالمادة أو أكل الفواكه اللذيذة، فإن جعل الأدب هادفا كذريعة الحاجة الإنسانية، خدمة كبيرة ، لكن لابد من النظر في أن الهدف كيف كان ، أكان ذلك محصورا في المصلحة الدنيوية التي تمتد إلى حب الذات و إشباع الشهوة، أم كان متضمنا للنصح و حب الخير، وتارة يكون الهدف ذا مؤامرة أن الناس يُضَلون من صراطهم المستقيم للمصلحة الشخصية ، و يرى مثال ذلك في الاتجاه الحالي للإعلام ، على كل ، فإن هدف النصح الإنساني يتحقق من القصص القصيرة ، فقد اختارت رابطة الأدب الإسلامي العالمية الغاية الإنسانية التي يرشد إليها القرآن الكريم والسنة النبوية خاصة طريق ترقيتها و تنميتها ، وتحقيقا لهذا الغرض تعقد هذه الندوات ، و، نعتبر ذلك خدمة كبيرة أن نقوم بتربية الإنسان بواسطة الأدب ، ونسأل الله التوفيق ، والقبول ، وهو ولي التوفيق ..

وفي الأخير نشكر سعادة الشيخ السيد نظام الدين أمير الإمارة الشرعية لولايات : بهار وأريسه وجا ركهنڈ، فإنه وفر لنا جميع التسهيلات اللازمة لعقد هذه الندوة في الإمارة الشرعية بفلواري ، و نشكر كذلك الدكتور عتيق الرحمن سكرتير رابطة الأدب الإسلامي لمنطقة بتنه لأنه ساهم في إنجاح هذه الندوة مساهمة كبيرة . ☆☆☆

تقرير سكرتير رابطه الأدب الإسلامية

محمد واضح رشيد الحسني الندوي
سكرتير رابطة الأدب الاسلامي
لقسم شبه القارة الهندية والبلدان الشرقية

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين وبعد :

أيها السادة ! فنحن نرحب بكم في هذه الندوة ونشكركم على أنكم تكرمتم دعوتنا بالقبول ، وتحملتم مشاق السفر للحضور في الندوة الأدبية التي تعقد من قبل المكتب الفرعي لرابطة الأدب الإسلامى العالمية في مدينة بتنه بتعاون من الإمارة الشرعية لولايات بهار وأريسه وجاركهند ، حول موضوع : القصة بالأدب الأردي ، وليس من ورائها إلا أن تدرس جميع المجهودات التي بذلت في هذا السبيل.

أيها الحفل الحضور ! إن سماحة العلامة الشيخ السيد أبو الحسن علي الحسني الندوي قد وضع اللبنة الأولى لرابطة الأدب الإسلامي العالمية، وكان رئيسها الأول ، بل الواقع أنه كان مؤسس فكرة الأدب الإسلامي، فانعقدت على دعوته الندوة الأولى العالمية للأدب في ندوة العلماء في ١٤٠١هـ المصادف ١٩٨١ م ، حضرها نخبة من الأدباء والشعراء من البلدان العربية فتكونت رابطة عالمية للأدب الإسلامي ، ثم ازدهرت هذه الفكرة و رحب بها الأدباء العرب أيضا ، ذكره بشيئ من التفصيل سماحة الشيخ الندوي في كتابه : في مسيرة الحياة :

" لا أزال أعتقد خلال أعمالي التعليمية والتدريسية ، وزمن حياتي التصنيفية والتأليفية أن الأدب يحمل قوة إيجابية وسلبية، يمكن أن يستخدم لتصحيح العقائد و تنمية النزعات الصالحة والبناءة في جانب ، وفي جانب آخر للهجوم على القيم الخلقية و لقمع الاضطراب الاجتماعي والذهني، وله نماذج ثابتة و لامعة في كل عصر ، لكن هذا العصر قد ازداد فيه شمولية الأدب وسيطرته بوجود الوسائل المستحدثة القوية ، نشاهد من مدة أن سيل الإلحاد التشكيك كما كان يأتي إلى المسلمين المثقفين بواسطة الفلسفة في الماضي ، ثم يسري إلى الطبقة المثقفة من طريق علوم الطبيعة ، وتارة من علم الاجتماع وعلم الاقتصاد والسياسة ، و يأتي الآن في الجامعات والكليات والمدارس من طريق الأدب .

مما يبعث أصحاب الدعوة والفكر الإسلامي على القلق المتزايد أن البلدان العربية وخاصة جمهورية مصر قد احتكر فيها على الأدب النقد والوسائل التي تغذي جيل الشباب الأدباء والمؤلفون الذين كان في عقائدهم التشكيك، و في أذهانهم الاضطراب. وفي كتاباتهم النزعة التشكيكية، فكانت الحاجة إلى أن تستخرج النصوص الأدبية والكتابية القوية المؤثرة من الأدب العربي و تبرز من خباياها، التي تغافلها الأدباء من تكاسلهم و اتباع المؤرخين القدماء، أو من جريمة أنها صدرت من قلم عالم و داع و شخصية دينية، فعوقبت بإخراجها من دائرة الأدب أو فصلها عنها، و تراكم عليها الغبار إلى قرون، ومست الحاجة إلى أن يدعى الأساتذة وأصحاب القلم والمثقفون من العالم العربي لأ ن يحاولوا في توجيه الأدب العربى والنقد والإنشاء وتاريخ الأدب إلى وجهة صحيحة و يكونوا مكتبة زاخرة و مدرسة فكرية لتغذية الجيل الجديد بالغذاء الصالح المفيد .

قررنا أن نعقد ندوة عالمية للأدب الإسلامي بندوة العلماء في ما بين (١٧ - ١٩ أبريل ١٩٨١م كان موضوعها : البحث في الأدب العربي وآداب اللغات الأخرى عن العناصر، وقد نالت هذه الدعوة من الدعوة في البلدان العربية أكثر مما كنا نؤمل ونتوقع، وحضر للمشاركة فيها في لكهنؤ عدد لا بأس به من الأدبار والشعراء الفضلاء من البلدان العربية، ومن كبار المؤلفين المعاصرين وعمداء كليات اللغة والأدب وصفوة الشعراء والأدباء الإسلاميين" .

إن الخطبة الاختتامية التى ألقاها سماحة الشيخ الندوي فى هذه الندوة سلط فيها الضوء على حاجة هذه الندوة و مقاصدها الأساسية واستعرض كل ما كان من عمل فى الهند يتعلق بالأدب الإسلامي نذكر هنا مقتبساً يعرف بالأدب تعريفاً حسناً .

"الأدب أدب ، سواء صدر من رجل ديني أو نبي ورسول ، أو كان موجودا في صحيفة، بشرط أن يذكر في أسلوب يكون مؤثرا وخلابا، وكان القائل مطمئنا أني قلته بأسلوب حسن ، ويتمتع به السامع ، و يقبله، وقد ذكرت أمس في الندوة أن حب الحسن هو أن يحب في أي شكل كان، إنك لا تستطيع أن تجبر البلبل على أن يجلس على تلك الشجرة ولا يجلس على هذه، لكن أين هذا من الإنصاف و حب الخير أن الوردة إذا تفتحت في فناء الحانوت فهي وردة يتمتع بها الإنسان ، لكن إذا تفتحت في حديقة المسجد، فلا جمال فيها، هل هذه جريمة أنها قد استندت إلى المسجد لبدوها وظهورها، لم

أتمكن من أن أنشد شعر إقبال أمام الجمع العربي ولكن أنشد أمامكم :

إن الجمال الفطري إذا كان يرغب لإظهاره في الغابات، و لا يريد المدن لذلك ، فهل الغابا ت أحسن و أصلح له أم المدن".

أي لا نحتاج إلى الصحارى والمدن بل حاجتنا هي الجمال والحسن أينما وجدا و حيثما وقعا، فعومل مع الأدب هذه المعاملة".

وكان من نتيجة هذه الندوة أن أهم أعضائها وشعرائها الذين كان أكثرهم من جامعة الإما م محمد بن سعود الاسلامية قد أسسوا رابطة الأدب الإسلامي في الرياض واجتمعوا بسماحة الشيخ أبى الحسن الحسني الندوي فى شهر مايو ١٩٨٤م فى مكة المكرمة وطلبوا منه التكرم بقبول رئاسة هذه الرابطة. ذكر العلامة الندوي هذه القصة مفصلة:

"رجعت من المدينة المنورة في ٧ مايو ١٩٨٤ إلى جدة ثم ذهبت للعمرة الى مكة المكرمة فلقيني وفد من الأدباء البارزين فى المملكة العربية السعودية ،وكان هذا الوفد يتكون من أساتذة الجامعة الإمام محمد بن سعود بالرياض والجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة مثل الدكتور عبدالباسط بدر، والاستاد حيدر غدير، والدكتور عبدالقدوس أبو صالح ، هؤلاء كلهم حضروا مكة المكرمة من الرياض والمدينة المنورة تحقيقاً لهذا الغرض وبينوا لي أهداف الرابطة وأغراضها وقدموا إليّ مسودة دستورها وقواعدها وأصروا عليّ أن أتشرف بقبول رئاستها وأسمح لهم بتأسيس رابطة عالمية."

فانعقدت ندوة عالمية كبرىٰ لرابطة الأدب الإسلامي في عام ١٩٨٦ توفية بهذه الحاجة، وتم الإتفاق على دساتير وقواعد للرابطة ، فتأسست رابطة الأدب الإسلامى وعقدت ندوتها الأولى لمجلس الأمناء فى استنبول بتركيا في يونيو ١٩٨٦م ثم لا تزال تعقد دوراتها السنوية لمجلس الأمناء فى المدينة المنورة والقاهره وعمان وأردن وفاس مراكش واستنبول وغيرها.

انتخب العلامة الندوى رئيسا للرابطة بعد تكوين رابطة الأدب الإسلامى وظل على هذا المنصب إلى وفاته ، فقرر لها مكتبان المكتب الأول للهند وشبه القارة الهندية والبلدان الشرقية ، والمكتب الثاني للعالم العربي، وعين سعادة الشيخ السيد محمد الرابع الحسنى الندوى،(عميد كلية اللغة العربية وآدابها بندوة العلماء آنذاك ورئيس ندوة العلماء حاليا) أمينا عاما للقسم الهندي والبلدان الشرقية والدكتور عبدالرحمن رافت باشا اميناً عاما للمكتب العربي، وكان مكتب الرابطة الرئيسى فى ندوة العلماء، ولايزال هذا المكتب يقوم بأعماله ونشاطاته طوال حياة العلامة الندوى ثم عين بعد

وفاته رحمه الله الدكتور عبدالقدوس أبو صالح رئيساً للرابطة فانتقل المكتب الرئيسى الى الرياض وانتخب سعادة الشيخ السيدمحمد الرابع الحسنى الندوى نائب الرئيس لرابطة الأدب الإسلامى ورئيساً لمكتب شبه القارة الهندية ۰

نالت فكرة الأدب الإسلامى وحركته قبولاً ورواجاً فأنشئت مكاتب فرعية تابعة لهٰذين المكتبين الأساسيين فى البلدان الإسلامية مثل الهند وبنغلاديش وباكستان والمملكة العربية السعودية ومصر والأردن وتركيا ومراكش والجزائر وعقدت عدة ندوات فى مدن مختلفة لهٰذه البلدان ولاتزال تستمر سلسلتها حتى الآن، أضف إلى ذالك دورتها السنوية لمجلس الأمناء التى تعقد للخوض فى قضايا الأدب الإسلامى ويكون اجتماع عام لجميع الأعضاء بعد كل ثلاث سنوات ۰

لقد قامت رابطة الأدب الإسلامى العالمية بإعداد ثروة أدبية قيمة حول مواضيع مختلفة للأدب مثل نقد الأدب وتاريخ الأدب والقصة والمسرحية وأدب الأطفال ، وتصدر مجلات أدبية من مصر وتركياوباكستان والمملكة العربية السعودية والهند كلسان حالها۰

أما مكتب الهند فقد أقام فروعاً كثيرة فى دهلى وحيدرآباد،و بهوپال، وأورنگ آباد، وممباىء وپونا وبهٹكل وبنگال وپٹنه ورانچى، وكان مكتبها الرئيسى فيلكهنؤ ولايزال يواصل سيره الأدبى بكل نشاط، وقد عقدت ندوات أدبية من مكتب الهند حوالى ٢٨ ندوة تحت موضوعات مختلفة ويستمر عقد الندوات لمكاتبه الفرعية حيناً لآخر وقد عقدت عدة ندوات حول الصحافة فى دهلى، وبهوپال،و بهٹكل ورائے بريلى وعقدت ندوتان فى پٹنه ورائے بريلى حول مكانة الأدبية للقصة ۰

أيها الحفل الكريم: من الحقائق الناصعة أن القصة من أهم أصناف الأدب و تحمل بعض الأحيان تأثيرا قوياً من الشعر، وان الشعر يكون أثره موقتاً لٰكن القصة تؤثر على الحياة كلها، وهذه حقيقة بأن عصر القصة وعملها يبتدئ قبل عصر الشعر وعمله وتكون بدايتها من حضن الأم، لان الأمهات كنّ يلهون أولادهن بالقصص من حيث الذوق والطبيعة، فتلعب هذه القصص دوراً مهماً فى بعض الاحيان فى تكوين اذهان الأطفال ، وقد قرأنا أن بعض الشخصيات الكبيرة قد سمعت القصص فى صغرها وطفولتها وكان أثرها قوياً غالباً وبعض القصص تكون مؤثرة فى النفسية والفكر۰

إن المعلمين والمصلحين كانوا يعتمدون لتكوين الذهن والتأثير فى القلب على القصة وتوجد ثروة زاخرة للقصص فى القرآن الكريم والحديث النبوي ، وردت فى القرآن الكريم فى مواضع مختلفة أهمية القصة ، قال الله تعالىٰ "فاقصص

القصص لعلهم يتفكرون" (الأعراف:١٧٦) وقال "نحن نقص عليك أحسن القصص" (يوسف:٣)

إن القصة أياكان شكلها وجدت في كل عصر ،وليست رابطة الإنسان بالقصة جديدة، بل إن رغبته بالقصة أزلية لأن بداية هذاالفن قبل فن التصوير ونحت الأصنام و الفنون الجميلة ، يقول عبدالقادر السرورى فى " دنيا فسانه":

"القصة أقدم فن للعالم ، لما اخترع ما وجد فى ذلك العصر فن التصوير ونحت الأصنام والفنون الجميلة إن القصص القصيرة قد عرفها العالم وكانت توفى حقها بكل شكل، لكن من وجهة نظريونانية كان هذا الفن أقدم من الشعر والموسيقى ، وكان من شموليته أنه لا يوجد قوم فى أى ناحية للكون كانت آذانهم غافلة عن القصة".

استعملت كلمة"النوادر" فى اللغة العربية والأدب العربى لهذا المعنى، وجمع عدد من المصنفين النوادر، فإن الأديب القالى قد جمع فى كتابه الأمالى النوادر، حتى قال بعض الأدباء :انها خلاصة الأدب العربى و كذلك كتب أخرىٰ للنوادر كانت فى العصر الجاهلى مجالس العرب، وتذكر فيها قصص فروسيتهم وشجاعتهم وسخائهم ومروء تهم ، تكون فيها قصص مشهورة أو خارقة للعادة ، وقد عقد المبرد فى كتابه الكامل عنوانا باسم أكاذيب الاعراب ،ذكر فيه قصصاً عجيبة، كان سيدنا معاوية رضي الله عنه يستمع إلى القصة فى عهده بكل شوق ،وكان فى العهد العباسى طبقة القصصاصين .

ويوجد بالإضافة إلى هذه القصص القصيرة قصص طويلة، فكانت قصة عنترة فى الفروسية و قصة حاتم الطائى فى السخاء و قصة سيف بن ذى يزن فى الفتح والنصرة والمقامات فى المكر والشطارة وقصة ألف ليلة وليلة ، وقد أخذ فن القصة أسلوباً جديداً فى الأدب العربى بعد تعرفه على الأدب الغربى منذ القرن التاسع عشر و حظى بالسعة والقبول من اليوميات والمجلات، فكان هناك كتاب للقصة جعلوا المجتمع موضوعا لها، وكان لهم سهم كبير فى التغييرالاجتماعى مثل مصطفى لطفى منفلوطى والدكتور طٰه حسين ومحمد حسين هيكل وجبران خليل جبران ومحمود تيمور ونجيب محفوظ وقد ترجمت قصص أكثرهم باللغة الأردية و منح نجيب محفوظ على كتابة القصة جائزةنو بل .

كان هدف القصة في العهد القديم ادخال السرور والمتعة ، ، فكما أن الأدب الغربي تأثر بها مختلف أقسام الحياة كذلك تأثر به الأدب ، و تأثرت به القصة والرواية والمسرحية ، وجعلت ذريعة لتكوين الذهن .

بدأ عهد القصص القصيرة بعد القصص العامة والروايات من القرن التاسع عشر ، كان

فيها المتعة مع الاهداف التي كانت أهم عناصر التعليم والتربية . فالأستاذ نذير أحمد، وعبدالحليم شرر، و مرزا هادي رسوا أو منشي بريم جند أو الروائيين في العهد المتأخر : سجاد يلدرم ، ونياز فتحفوري وآل أحمد سرور وقرة العين حيدر و قدرة الله شهاب ، كلهم جعلوا المجتمع وقضاياه موضوع آدابهم فجعلت القصة تكون الذهن ، وبدأ كتاب القصص حكاية أحوال المجتمع والحياة الفردية، حسب تصورهم . ، وكان فيهم بعض أصحاب القلم الذين يعرفون فن القصة معرفة جيدة ، لكن هدفهم كان تصوير المجتمع ، وكان منهم الذين يجعلون القصة ذريعة لجعل الحياة الصالحة ، وجعل بعضهم التاريخ موضوعهم ، لأن الأمم تتعلم من التاريخ و تكسب منه دروسا في تكوين حالها ومستقبلها .

يمكن أن يقسم كتاب القصة باللغة الأردية إلى طبقات مختلفة : المصلحون والقصاص ودعاة الى الأفكار والنظريات الغربية، وقد قدم بعض الأدباء المتقدمون في عهد الشيوعية القيم الخلقية ونظمها في ثوب جديد، و استهدف في بعض كتاباتهم الدين الاسلامي، وقدم في بعضها نظام حياة الغرب بغض النظر عن القيم الخلقية والمثل العليا . فجعل الأدباء الاسلاميون القصة ذريعة لبقاء احترام العقائد والأخلاق والتر غيب في التحلي بها ، وان ما استهزأ أصحاب القلم من الغرب بالتاريخ القديم و قاموا بالتزوير والتحريف فيه ،استند الاسلاميون فيه الى القصص والروايات لوقاية الجيل الجديد من الخزيان واحلال الشخصيات الكبرى على مكانتها العالية، واعطاء التاريخ الاسلامي حقه .

هذا هو موضوع ندوتنا ، و تقدم فيها خدمات و مساعي الشخصيات الأدبية و استعراض فن القصة في الأدب الأردي ، التي حازت مكانة عالية في مجال القصة و يكون التركيز خاصة على الشخصيات التي جعلت القصة بناءة و غمطت حقوقها في الأوساط الأدبية .

من بواعث الفرح والسرور أن قد اجتمعت شخصيات أدبية معروفة بهذه المناسبة ، نحن نرحب بها ، و هذه الندوة اليومية لا تسع لتسليط الضوء على جوانب مختلفة للموضوع ، فوجهت رسائل إلى المندوبين على نطاق محدود ، نرجو أن ستعقد ندوة على أوسع نطاق بمناسبة أخرى .

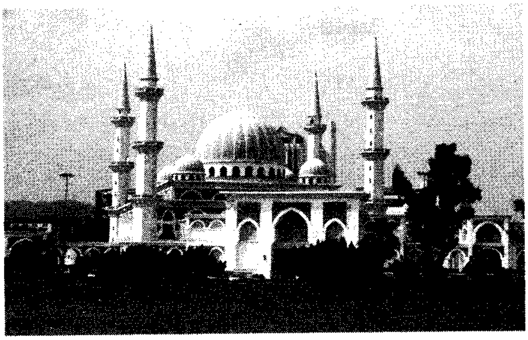

القصة الإسلامية : نموذج للجمال الفني والمعنوية

في ضوء سورة يوسف

فضيلة الشيخ الدكتور سعيد الأعظمي الندوي

إن مصطلح القصة معروف لدى أهل الأدب لتقديمها في أسلوب جميل مؤثر، و من عناصرها الأساسية الخيال والوجدان، ويتجلى مع ذلك روح المعنوية والمزايا الفنية ، و لا يستهان بقيمة القصة وأهميتها في الأدب الإسلامي، فلا بد أولا من جمع الأفكار بحيث يتكون جو ملائم لسماعها وقراء تها، ويحصل للناس فائدة كبير من دورها الإيجابي .

إن أهم مزية للقصة الإسلامية أنها تظهر فيها جميع الجوانب البناء ة مع الصدق والأمانة ،ويوجد فيها ملامح القيم الخلقية ، التي تكون الأذهان و تملأ القلوب عواطف بناء الحياة الصحيحة الإنسانية، بذلك يتشكل مثال كامل للجوانب التوبوية والعقدية والنفسية .

إن جميع قصص القرآن تتحلى بالخصائص الفنية المؤثرة و يتجلى عنصرها الدعوي والتربوي لكن قصة يوسف تحمل مكانة بارزة من بين قصصه بمنهجه الأدبي والفني ، فقبل أن تبدأ القصة أشير إلى كونها آية من آيا ت القرآن الحكيم، وأنه أنزل في لسان عربي مبين : قال عز وجل : إنا أنزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون ، ثم تبتدئ القصة ، وقد خوطب محمد رسولنا العظيم صلى الله عليه وسلم ، وكانت الشخصية التي ستدور حولها القصة هي سيدنا يوسف عليه السلام، لا يستطيع أي كاتب بارع أو فنان أن يصور جوانب حياتة عليه السلام من أولها إلى آخرها بأسلوب بليغ كما صورها القرآن ، بل الحقيقة ليس في وسع أي كاتب مترسل .

توجد في شخصية يوسف عليه السلام جميع الجوانب الإنسانية ، ففيها الهم والفرح، وفيها أسبا ب القنوط من رحمة الله تعالى، ومواجهة ابتلاء ات أنكى وأفظع، ثم امتحان الإخوة، ثم إلقاوه في البئر، وبيعه في سو ق مصر مثل عبد و مملوك بثمن بخس دراهم معدودة، بواسطة قافلة تجارية، ثم فتنة امرأة العزيز، و إعجابها به، و امتحان إلقائه في السجن، ثم تمكنه من سرير الحكومة، وأخذه منصب أمين المال، وأداؤه مسئوليات الحكومة بكل دقة وأمانة، ومواجهته الجدب والقحط، واستغاثة إخوانه، وتدرجه إلى درجات عالية، وطلب إخوانه المعذرة منه، ثم تعبير رؤياه التي رآها في صغره ودعاؤه أمام الله رافعا أكف الضراعة والخشوع : ﴿رب قد آتيتنى من الملك وعلمتني من تأويل الأحاديث ، فاطر السماوات والأرض ، أنت وليي في الدنيا والآخرة، توفني مسلماً وألحقني بالصا لحين﴾ (سورة يوسف : ١٠١)

ويظهر مفتاح النجاح في هذه الابتلاء ات بقوله تعالى: إنه من يتق و يصبر، فإن الله لا يضيع أجر المحسنين .

ثم ذكر الشيخ الدكتور سعيد الأعظمي الندوي قصة يوسف بالأسلوب الأدبي الجميل باللغة الأردية .

القصة في اللغة الأردية في ضوء الأدب الإسلامي

محمد ثناء الهدى القاسمي
(نائب رئيس الإمارة الشرعية، بتنه، بهار)

الإنسان مفطور على القصة والحكاية، فحينما يجلس مع أهله و أصحابه في المساء لاغباً مجهوداً، يحكي قصص طول النهار بكل شوق، ويلفت الآخرين إلى نفسه، قال الأستاذ على عباس الحسيني:

"تبتدئ القصة منذ عرف الإنسان المدنية وعلم العمران"، وكان موضوع القصة في الزمن القديم الحوادث الكبيرة والوقائع الدامية وأحوال الحروب، وقصص الجنيات وحكايات النساء، فإذا طالعنا قصص الهند القديمة اتضح لنا أن موضوعاتها كانت مثل ذلك، وكانت طريقة حفظ القصص أن تكتب في المذكرات واليوميات، لئلا يندر وجود ها مع مرور الزمن، وتكون تذكاراً في التاريخ للأجيال الآتية، هذا الشعور قد رقى فن القصة، وكانت هذه القصص في أول الأمر ساذجة، وكان فيها امتداد قصصى، وتخلو من الصناعة الفنية المزركشة وعلم البديع، فتخرج من القلب وتقع في القلب.

إن أول قصة ظهرت على وجه الأرض قصة آدم عليه السلام، التي ذكرها القرآن غير مرة في القرآن الكريم، ولما ثار إبليس ضد النظام الإلهي أرسل الله الأنبياء والرسل، ويكفى لمعرفة قدسية القصة أن الله تبارك و تعالىٰ سمى قصة يوسف بأحسن القصص، ونسبب القصة إلى نفسه: وإليكم هذه الآيات: قال الله عزوجل: نحن نقص عليك أحسن القصص بما أوحينا إليك هذا القرآن- وإن كنت من قبله لمن الغافلين (يوسف: ٣) وقال: منهم من قصصنا عليك من قبل (النساء: ١٦٤) وقال: وتلك القرى نقص عليك من أنبائها (الأعراف: ١٠١) وقال: كلا نقص عليك من أنباء الرسل (هود: ١٢) وقال: نحن نقص عليك نبأهم بالحق (الكهف: ١٣) وقال: كذلك نقص عليك من أنباء ما قد سبق (طه: ٩٩) وقال: ذلك من أنباء القرى نقصه عليك (الأنعام: ١٠٠) قال الشيخ حفظ الرحمن السيوهاروي في كتابه قصص القرآن:

"إن قصص القرآن كلها تتحدث عن المجادلة بين أولياء الرحمن وأولياء الشيطان، وهي ذات عبرة ونصيحة".

فالقصة في الإسلام ليست إلا لأهداف عالية نبيلة، وإن الإسلام يفسح للقصص التي تعرف الإنسان بالله وبنفسه، وتعلمه المثل العليا والقيم الخلقية.

وقد تطور فن القصة، فظهرت إنتاجاتها في صورة قصة أمير حمزه، وطلسم هوش ربا، وفسانۂ عجائب، ثم قام بتهذيبه الأستاذ نذير أحمد والأستاذ ألطاف حسين حالي بكتبهما: مجالس النساء، ومرآة العروس وابن الوقت و توبة النصوح، ثم أتي بعدهما الأستاذ صادق السردهونوي والأستاذ نسيم الحجازي، لكنهما اختارا أسلوب التنميق في القصة، ثم قدمت في أسلوب حسن القضايا الاجتماعية خديجة مستور، وصالحة عابد حسين، وكان للأساتذة ايم أسلم، وقيس الرامفورى ورئيس الجعفري وراشد الخيري ومحمد علي طيب دور بارز في تنمية القصة.

وقد أنتج الأستاذ بريم جند قصصاً قصيرة موافقة لطبيعة هذا العصر المكفهر الأحوال، وقد مرت القصة بمرحلة الحداثة، ثم الآن تمر بمرحلة ما بعد الحداثة، ويمتاز في هذا الجانب الأستاذ أحمد نديم القاسمي، وتطور فن القصة في ولاية بهار، ويجدر بالذكر في هذا العصر الأستاذ شفيع المشهدي وشوكت حياة، وعبيد قمر.

ولا ننسى بهذه المناسبة مساهمة مائل الخيرآبادى، وطالب الهاشمي، وابن فريد، والأستاذ عامر العثماني والأستاذ إسماعيل الميرتهى، والشاعر حفيظ الجالندهري، في القصة نثراً ونظماً.

فالحاجة إلى أن تقدم هذه القصص حسب الموضوعات إلى ذهن القراء- ليرغبوا في قراء تها.

الأدب الإسلامي والقصة

الدكتور شكيل أختر
(محاضر كلية اللغة العربية والأدب العربي، بتنه)

القصة فن من فنون الأدب، يصون الإنسان بها نفسه من اللهو واللعب والكلام الفكاهي، ويريحها، ويكون العقل والفكر صالحين من القصة، إن دراسة التاريخ الأدبي للأمم الماضية تبين أنها لما بدأت تعيش الحياة الاجتماعية صارت القصص والحكايات جزء حياتها. فكانت هناك قصص شهيرة في آداب الأمم الهندية والفارسية واليونانية والرومية، وولم تنل بعض الحكايات منزلة قومية فحسب بل منزلة عالمية.

العرب أقدم الأمم في الدنيا، الذين رأوا أحوال الحياة وهادها و نجادها، وتارةً بينوا التجارب الحاصلة منها في صورة النثر والشعر، فالقصة إحدى الأنواع الموضحة في النثر، وكانت عامة عندالعرب، وكان العرب وقت ظهور الإسلام يقضون لياليهم في القصص الفكاهية، يذكرون فيها مآثراً أسلافهم وشجاعتهم وبطولتهم كما يظهر ذلك في أقوال الصحابة رضي الله عنهم، قيل لبعض أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ماكنتم تتحدثون به إذا خلوتم في مجالسكم؟ قالوا: كنا نتناشد الشعر، ونتحدث بأخبار جاهليتنا، وقد كان دأب معاوية رضي الله عنه أنه يقضي جزءاً من الوقت في سماع القصص والحكايات فكان سماع القصص وذكرها منذ العهد الإسلامي الأول.

يشهد التاريخ أن أسلافنا الذين كانوا يرعون الأغنام ويسرحون الإبل، و يشتغلون بأمورتافهة، وما كانت عندهم حضارة ولا ثقافة، ولاكتاب ولا مدرسة، ولازاويه ولا خلق نبيل، كل قبيلة لهم مستبدة برأيها، وأطبق الجهل والضلال أعين الناس، لكنهم لما استفادوا من هذه القصص صاروا هداة الإنسانية ودعاتها.

الخلاصة أن للقصة سلسلة تمتد إلى الآداب الإسلامية عند العرب، وكان عندهم ثروة كبيرة لها، وهي تتلخص في القصص والروايات والقصة القصيرة والمقامات، وتعرف سعة القصة في الأدب الإسلامي من أن الروائى المشهور بجمهورية مصر محمد حسين هيكل الذي ألف كتبا مسهبة حول محمد صلى الله عليه وسلم والخلفاء الراشدين والصحابة الكرام قد تناول في كتبه خصائص الإسلام وعلومه الأساسية. فحاز بتأليف كتابه: عبقرية أبي بكر الصديق جائزة عالمية. ☆☆☆

فن القصة ولغة أردو

الدكتور أرمان النجمي (بتنه)

القصة ترجمان النزعات الفكرية والاجتماعية في كل قوم و منطقة، وهى تشعر الإنسان بعلاقته بالماضي، وتبحث عن الروابط الفردية والجماعية، بل تخبر حيناً عن التاريخ والجغرافية، فيكون مجلس القصة مبعث علم و معرفة.

تعم القصة الرجال والنساء والحكماء والأمراء و تتسع لجميع المخلوقات : الحيوانات والطيور والبهائم والسباع ومظاهر الكون من الجبال والأنهار والسحاب والأمطار والغابات والأشجار والأرض والسماء.

إن القصة باللغة الأردية كانت محدودة في موضوع التاريخ، وقد استعمل الشعراء في المعنى نفسه، تزخر اللغة الأردية بالقصص الكثيرة مثل قصص آلهة الهندوس وقصص المحبة، وقصة شهزادة سليم وأنار كلي وليلي مجنون، وقصص الأنبياء المرسلين مثل آدم ونوح و إبراهيم ويوسف و مريم وعيسىٰ ويونس ومحمد صلى الله عليهم وسلم وغيرها. وفي الهند كان فن القصة موجوداً منذ زمن قديم مثل قصة غوتم بده و ويد وبران ورامائن ومهابهارت.

(قصص الهندوس)

فن القصة في الأدب الإسلامي

الأستاذ محمد بدر الدين الفريدي
(مكتبة خدا بخش، بتنه، بهار)

لكل رقي تاريخ، فإن القصة في الأدب الإسلامي تبتدئ منذ هبوط آدم عليه السلام، وتأتي خلال ذلك قصته قابيل و هابيل ابني آدم، وقصة نوح، وقصص هود، وصالح وإبراهيم و لوط، وإسماعيل وإسحاق، وقصة يعقوب و يوسف و شعيب عليهم السلام.

إن قصص موسى وأخاه هارون و فرعون وهامان والخضر من أوسع القصص فناً، ويدرس المشتغل بالقرآن قصة داؤد و طالوت وجالوت وسليمان وملكة سبا، أما قصص أيوب ويونس وذي الكفل فإنها من أمثال هذ ه القصص.

تعتبر قصة زكريا و يحيي ولقمان و بيت المقدس من أهمها في العصر الحديث، وكانت قصص ذي القرنين و سد سكندر وياجوج ومأجوج وهاروت وماروت ومآرب وإرم، وأصحاب الأخدود وقوم تبع وأصحاب الفيل مهمة من حيث الشكل والتمثيل. يجري البحث الآن بأسلوب حاد في قصص مريم وعيسى وحواريه، و هذه القصص كلها كانت قبل بعثة النبي صلى الله عليه وسلم شائعة بين اليهود والنصارى.

إن القرآن قد تحدث عن النبي صلى الله عليه وسلم وعن القصص التي كانت حديث مجالس اليهود والنصارى، وقد ذكر من القصة ملكان ذريعة هداية وإرشاد، ونقل ما كان صحيحاً وصادقاً. استعمل القرآن للقصة أربعة ألفاظ: القصة، النبأ، الخبر، الأسطورة.

وقد وردت القصص في الحديث النبوي، فرتبت قصص الحديث وحكايات الصحابة والتابعين والتابعات والنساء المسلمات، وتستمر هذه السلسلة إلى الآن. ☆☆☆

القصة في الأردية: نشأتها وتطورها

الدكتور محبوب إقبال (مظفر نور)

القصة في طبيعة الإنسان، وقال علماء علم العمران: إن الإنسان يرغب في القصص وينوع كلامه حينما لم تكن عنده أصوات لفظية ،كان من ثروات الآداب البدائية. كليلة دمنة، وبنج تنتر، وجاتك كتهائين.

ثم جاء عصر طلسم هوش ربا، وطلسم حيرت وطوطا منى وقصة مهرافروز ودلبر، وترجمت قصة ألف ليلة وليلة إلى الأردية عدة مرات.

وابتدأ عصر الرواية في منتصف القرن التاسع عشر الميلادي، واتفق جميع النقاد على أن الأستاذ نذير أحمد أكبر روائي، وأول رواية له مرآة العروس، وقد كان للأساتذة سرشار وعبدالحليم شرر و شاد العظيم الآبادي دور كبير في هذا المجال. واشتهرت في النساء في هذا الموضوع رشيدة النساء، وإن أكبر رواية في اللغة الأردية: امراؤ جان ادا لصاحبه مرزا هادي رسوا، طبع لأول مرة في ١٨٩٩م.

مع تطور الزمن ابتكر فن القصة القصيرة، واشتهر في هذا الأستاذ علي محمود،و راشد الخيري، وبريم چندر، وأختر أورينوى وسعادت حسن منتو، وسهيل العظيم الآبادى، وقرة العين حيدر.

وليعلم أن للنظم مساهمة في تنمية فن القصة فقرضت قصائد مطولات منظومة أمثال قطب مشترى. وعلى نامه. وسحرالبيان، وكلزار نسيم، وزهر عشق (سم العشق). وفريب عشق (خداع العشق).

وقد كانت المسرحيات قد نتجت من القصة وتوسعت حتى اتصلت بمسلسلات الأفلام، إن القصة هي الأصل، لو لم تكن لما كانت للأصناف الأخرى حياة وبقاء. ☆☆☆

تاريخ القصة باللغة الأردية

الدكتور نسيم أحمد نسيم (بتنه)

إن تاريخ القصة باللغة الأردية جد قديم، وكانت القصص في العهد القديم تشتمل على الحكايات وأخبار الحب والأحاديث الفرعية، وكانت أهم مواضيعها أربعة: قصص الحيوانات، والسحر، والشهوة، والحرب والضرب، بالإضافة إلى الدين والأخلاق، وهذه القصص مستفادة من اللغة السنسكريتية القديمة واليونانية والرومية، وتتضح من دراستها معالم القصة في إيران والعرب.

بغض النظر عن وصف الصيد في دكن (حيدرآباد) نجد آثاراً منثورة و منظومة منذ القرن الرابع عشر الميلادي إلى القرن الثامن عشر. فظهرت كتب عديدة، منها: سب رس، وطوطي نامه، ونشأ اتجاه القصة في الهند الشمالية في القرن الثامن عشر الميلادي، وكان هدفه بناءاً و إيجابياً، وكان من نتاجه: كربل كتها(١٧٣٣م) ترجمة كتاب روضة الشهداء لملا حسين الواعظ، بعد إعداد هذه الكتب ألف مير أمن كتابه باغ و بهار (بريق ولمعان)، وحيدر بخش: آرائش محفل (زينة المجلس) وگل مغفرت (زهر الغفران)، وكلا المؤلفين كانا ماهرين في القصة، ثم ألف شير علي أفسوس كتابه باغ أردو، وهفت كلشن و شكنتلا.

إن تاريخ القصة باللغة الأردية بالضبط يبتدئ من داستان أمير حمزة، رتبه خليل علي خان وعبدالله البلجرامي لأول مرة، ثم قام بتنسيقها من جديد الأستاذ تصدق حسين وأعدت مجلدات ضخمة لكتاب "طلسم هوش ربا" و "بوستان خيال"، ألفه مير محمد تقي، ثم كانت هناك امتداد قصصى، وألفت كتب كثيرة في فن القصة ثم جاء عصر الأستاذ نذير أحمد وعبدالحليم شرر، ومرزا هادي رسوا، والسيد أحمد خان. ☆☆☆

تاثير اللغة العربية في القصص باللغة الأردية

الأستاذ أبو الكلام القاسمي الشمسي
(مدير المدرسة الإسلامية شمس الهدى، بتنه)

القصة طبيعة الإنسان، وظل هذاالفن موضوعاً أثيراً لديه منذ الماضي إلى الآن، يشهد التاريخ أن القصص كانت توجد باللغة العربية، وكان لها قسمان: القسم الأول: القصص القومية التي تذكر فيها شجاعة الشجعان والمآثر الحربية مثل قصة عنترة والزبير سالم بن بللا، والقسم الثاني: القصص المترجمة من اللغات الأجنبية إلى اللغة العربية، مثل قصة شريك، (رجل من اليونان) صاغها العرب في لون عربي خاص.

إن الأساس المتين للقصص: القرآن الكريم، وقد تناول القرآن قصص الأنبياء والأقوام والمدن ووفر بذلك العبرة والنصيحة للآخرين، وهناك قصص في القرآن الكريم، لكن أطولها قصة يوسف عليه السلام.

كان النثر و كتابة القصة قليلاً جداً في الأدب العربي، لكن جاء ابن المقفع فوسع دائرة هذا الموضوع، وترجم كليلة ودمنة وألف خرافة و غيرها، فاز داد شوق العرب بقراء تهما، وقد أخذا العرب هذا الفن من اليونان وأضافوا إليه شيئاً وزادوا فيه مزايا متعددة ،فإن كتاب ألف خرافة، ترجم في القرن الثالث الهجري من اللغة الفارسية فأضيف إليه قصص اليهود والهنود وحكايات الخلفاء والأمراء وأخبار الأبطال في الجاهلية والإسلام ، وما زال هذاالعمل مستمراً حتى القرن العاشر، فاستدرك الفن ماكان مهجوراً، وقل لون الفارسية حتى ندر وجودها، إن هذاالكتاب يصورالعصور الوسطیٰ في العهد الإسلامي خاصة أخلاق المسلمين وتقاليدهم ونظم حياتهم، أثرت اللغة العربية على إيران رغم تميزها بالأدب والعلم والثقافة وسيطرت في قرنين عليها حتى نبغ من إيران رجال باللغة العربية نالوا صيتاً حسناً وراسلوا في هذه اللغة وبذلوا مجهودات في تعميم اللغة العربية وما زالوا يؤلفون و يصنفون ويخطبون باللغة العربية حتى قبل بعض رجال إيران الإسلام.

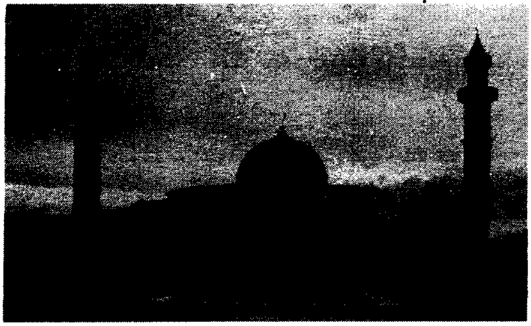

أسلوب القصة الأردية في عهدها الأول

الدكتور شهاب ظفر الأعظمي (بتنه)

لم يتعين حتى الآن من كان أول قاص، وممن قصه، لكن لا مناص من أن القصة من طبيعة الإنسان، وإن علاقتها بالحياة الإنسانية قديمة جدا، ولعل بدايتها من وجود النسل الإنساني.

كان يتصف أسلوب القصة في بداية الأمر بالإسهاب، ثم تمكن منها الخيال والعشق والأمور الخارقة للعادة، وانتقل إليها رويدا رويدا المبالغة والإفراط، إن أول قصة باللغة الأردية قصة منظومة، ظهرت إلى حيز الوجود عام ٨٦٥هـ المصادف ١٤٢١م، وأول قصة بالنثر "سب رس" كتبت عام ١٠٤٥هـ المصادف ١٦٣٥م، فصار فن القصة في مدة قريبة أهم أصناف الأدب الأردي، وإن كتاب "سب رس" يحمل طابع الجمال والحسن بين الكتب الأخرى، لأن الكتب الأخرى تخلو من جودة التعبير و حلاوة الألفاظ، و إن القصة الشهيرة الثانية: قصة مهر افروز دلبر كتبها عيسوي خان بهادر من سكان دهلي، وهي في ٣٧٦ صفحة، لكنها ساذجة بسيطة، واستعملت فيها الألفاظ والتعبيرات الدارجة والعامة التي زادت القصة بهاء، فأحرزت ثقة الناس، وأقبلوا عليها قراءة وسماعا، أما قصة نو طرز مرصع لصاحبها مير عطا حسين خان تحسين الذي كان شاعرا فارسيا وكاتبا للنثر و متقنا في الخط جيدا. فقد أخذت من جهار درويش، و وهي محلاة بالقافية والوزن والألوان الجميلة، و استعمل فيها علم البديع رغم وجود الكلمات الفارسية والعربية، وكتب على هذا المنوال جند كهتري "نو آئين هندي"، عام ١٧٩٦م.

وإن ما نتجت القصص من مساعي كلية فورث وليم هي أيضا مؤثرة جدا، مثل باغ و بهار، فإنها تحمل الخصوبة والقوة والجمال، الذي يتجلى من كل سطر من سطوره. ☆☆☆

مكانة بريم جند الإنتاجية

الدكتور تابش مهدي (دهلي)

كما أن الغزل نال قبولًا ورواجاً بين الأصناف الأخرى للشعر، كذلك القصة القصيرة نالت صيتا حسناً في أقسام النثر المتعددة، إن كاتب القصة القصيرة يودع في قصته معلومات كثيرة بألفاظ قليلة، وكان من أبرز كتابها المنشي بريم جند (١٨٨٠م–١٩٣٦م). فإنه أفاض على القصة القصيرة لوناً أعجب بها الناس الخاصة منهم والعامة.

نشأ بريم جند في قرية، وقضى أيام طفولته هناك، فجعل موضوع القصة القصيرة الحقول والمرابد و البساتين، ليس من دأبه أن يكشف عن مساوئ الإنسان، بل إنه يبحث عن المواهب المكنونة في الإنسان ثم يقدما صافية لماعة.

إن بريم جند شاهد حياة القرى عن كثب، رآها بأم عينه، فيعرف أن الفلاح كيف يقضي حياته، وما هي نفسيته، وما ذا يتمنى من الأماني، إنه عاش في المجتمع لكنه لم يصرف وجهه عن سوءاته، بل حاول لإزالتها وآسى لكل ملهوف، ومسح عن أعين اليتامى دموعهم.

كان بريم جند حامل لواء التضامن في الهند، ويتصل اتصالًا مباشراً في قصصه بتقاليد الهند الاجتماعية والثقافية، أما رواياته فهي خلاصة لثقافات قرون في الهند، إنه من كتاب القصص المعدودين الذين وجهوا فن القصة إلى وجهة، يستفيد منها الأجيال الآتية. ☆☆☆

الأسس الدينية للكتابة الأردية

صفدر إمام القادري (بتنه)

إن أول نموذج للكتابة النثرية باللغة الأردية "سب رس" لصاحبه ملا وجهي، ألفه في عام ١٦٣٤م، ويعرفه مؤرخو الأدب الأردي كقصة أولى غير دينية، فكان هذا الكتاب أساساً للنثر الجديد والقصة، فاستفاد الكتاب من هذا المؤلف.

ينشأ هنا سؤال أن ما هو السبب في استناد هذا الكتاب؟ فالواقع أن هذا الكتاب يتحلى بالقافية ووصف الأشخاص وصفا بارعا بالتشبيهات والاستعارات في أسلوب نثري، وأكثر جمله طويلة لكن طرق استعمال الألفاظ بديعة، يسر بها القراء، ولا يوجد فيه غموض و لا خفاء من حيث المعنى.

وإذا بحثنا عن أساليب الكتابة في تاريخ الرواية ظهرت لنا في القرن التاسع عشر الميلادي أسماء الأدباء مثل نذير أحمد ورتن سرشار وعبدالحليم شرر، إن الأستاذ عبدالحليم شرر، انتقى المواد من تاريخ الإسلام، وتناول رتن سرشار في رواياته عهد زوال وانحطاط لكنؤ، والمجتمعات المسلمة وانحطاط القيم الإنسانية ثم سار على هذا بريم جند، وهو مطبوع على بساطة الأسلوب ويلمع اسم بريم جند في أدباء القرن العشرين، وقد اختارت قرة العين حيدر أسلوباً غير أسلوب بريم جند، لكن كانت علاقتها بتاريخ الإسلام وحضارته وتقاليد الدين الإسلامي قوية.

من إحدى أقسام القصة المسرحية، ويعرف وعلى وجه العموم أن لا علاقة للمسرحيات بالحضارة الإسلامية فليس هنا ارتقاء لهذا القسم. لكن هناك بعض المسرحيين الذين قاوموا الوضع السائد بكل جودة، وكان مرزا أمانت وآغا حشر من البارعين في هذا الموضوع وقد كان امتياز على تاج منهم، ويعترف الأدباء ببراعته.

فن القصة وقصائد المثنوي القديمة باللغة الأردية

الدكتور منظر إعجاز (بتنه)

كلمة مثنوي مشتقة من اثنين اثنين، وهي عربية. وإن المثنوي يحمل مكانة كبيرة في الأصناف الشعرية الأخري، وهو قسم منظوم بياني، يوجد فيه المتعة والنغمة. وقال الشيخ جلال الدين "إن المثنوي صنف يوجد فيه نماذج جميع أصناف الكلام، وقال العلامة شبلي النعماني: إن صنف المثنوي أكثر فائدة وسعة وشمولية.

تجب على شاعر المثنوي مسئوليتان مزدوجتان، مسئولية النظم، ومسئولية القصة، فهو يصوغ القصة في أسلوب النظم، ورد هذا القسم في اللغة الأردية من إيران، وليس عند العرب قسم يكون بمثابة ذلك إلا أن الرجز يساويه، وقد استنبط شعراء إيران قسم المثنوي من الرجز، فهو من اختراع إيران، وإن كانت كلمته عربية، وقد كان في تكوين هذا القسم أبو شكور البلخي والرودكي، والدقيقى والفردوسى والسنائى، وعطار والرومي وأمير خسرو.

أما باللغة الأردية فهو من جهود العلماء الربانيين، واعتبر الأستاذ نصير الدين الهاشمي "كدام رأ وبدم راؤ من أقدم المثنويات، وهو في القرن الخامس عشر الميلادي في زمن أحمد شاه الملقب بنظام شاه.

ومن أشهر المثنويات القديمة:

١ – خو ش نامه لميراں جی شمس العشاق
٢ – قطب مشترى - لملا وجهي
٣ – سيف الملاك وبديع الجمال للغواصى
٤ – خاور نامه لرستمي وأمثال ذلك

فن القصة ومؤلف "سانحه عظيم" للشيخ اجتباء الحسن الكاندهلوي

محمد اصطفاء الحسن الندوي (لكناؤ)

من أهم أصناف الأدب المنثور القصة، وا بتدأ فن القصة في١٩٠٧ أو ١٩٠٨م، وكان من أشهر الكتاب بالأردية بريم جند أو سجاد يلدرم، فانهما ترجما القصص الأوربية باللغة الأردية في أول الأمر، حتى قيل: إن بريم جند قد سرق فن القصة من الأدب الانجليزي، وسجاد يلدرم سرق كذلك من اللغة التركية، ثم كتب كلاهما قصصا فطرية، وقدم مسيرها، حتى ارتقى هذا الفن وبلغ الى أوجها، ونبغ فيه الأدباء وكتاب القصص المهرة، لكن قل فيه عدد كتاب القصة الذين توجد في قصصهم ملامح تهذيب الأخلاق والفضائل الانسانية. فلم يعد هذا الفن بنفع مرجو في المجتمع الأردي، وكان هنالك عدد من الكتاب في الأوساط الدينية، الذين كتبوا القصة وقدموا نموذجا صالحا للأدب الاسلامي، منهم الأديب مائل الخير آبادي والأديب مقبول أحمد السهارنفوري، وجمعيات و منظمات تعنى بجانب القصة، لكن هؤلاء ركزوا على أدب الأطفال، أما أدب الشباب والرجال فلم يظهر إلا في صورة الرواية التاريخية الاسلامية، ذكرت فيها قصص التاريخ الاسلامي، وجعلت للترفيه ممزوجة بأسلوب الحب والهيام، بحيث يطرأ على القصة جانب الرجل المحب المولع بالعشق المادي لا الرجل الباسل الشجاع، اللهم إلا بعض الأدباء مثل الأديب المشهور نذير أحمد.

وهناك كتاب للروايات الإسلامية لا التاريخية فقط، كان يوجد فيهم الانسجام خاصة في قصص الأطفال، ولا يقصد في هذه القصة النزول إلى أعماقها، ولا التعبير عن العواطف في ضوء البيئة، بل يصل القارئ بسهولة إلى ما يوجد في ثنايا القصة من سلسلة متقطعة، ويصور الأديب في القصة المشاهد تصويرا كأن ورق الكتاب قد انشق وتمثلت الحقيقة رأي العين، وهذا ما يكون في قصة أو رواية أو مسرحية، وهي ميزة خاصة لفن القصة الشائع، وفإن كتاب القصص ينتجون بعض الأحوال والمناظر من أنفسهم ولا مجال لها في القصص الصادقة، لكن الكتاب قدموا القصة التاريخية في صورة رواية لئلا تتقلل قيمة قصصهم.

لكن العالم الجليل الشيخ اجتباء الحسن ألف كتابا ذكر فيه أحوال النبي ﷺ، من ولادته إلى وفاته، وصورها تصوريرا، كأنه المؤلف رحمه الله كان حاضرا وموجودا آنذاك، هذا الكتاب في الواقع مقال مسهب، كتبه الشيخ في عام ١٩٦٨م، طبع في مجلة " فاران " ثم طبع في صورة كتاب ١٩٩٣م، هذا الكتاب ليس مفاجأة في فن القصة، لكنه مظهر لتطور أسلوبه. يتأثر به القارئ أثناء قراءته، وهو دراسة فنية نادرة.

الرواية الإصلاحية للأستاذ نذير أحمد

إعجاز علي أرشد
رئيس قسم اللغة الأردية، جامعة بتنه بهار

اعترف النقاد بأن الأستاذ نذير أحمد أول روائي في اللغةُ الأردية وسلموا بعض مؤهلاته في هذا الفن، لكن الاعتراض الذي وجه إلى رواياته أن الهدف قد استولى على الفن، ولا شك أن الأستاذ نذير أحمد كان أحد رواد الحركة الإصلاحية التي نشأت خلال استيلاء الإنجليز على الهند، وكان المجتمع الهندي في هذه الآونة مصاباً بمرض السرطان الخلقي، كانت هناك طبقة تؤمن بالحضارة الغربية، وطبقة تتحاشي عنها، فقام الأستاذ نذير أحمد خلال ٢٥ عاماً بكتابة سبع روايات، وأشار في كل رواية إلى مرض خلقي أو زيغ عقدي للمسلمين، وقد انتقد بعض الأدباء على تشبثه بالدين فأجاب الناقد المعروف كليم أحمد:

"إن الرواية فرع للأدب مثل الشعر، لكننا ننسى هذه الحقيقة ولا نعد الرواية في الأدب، بل نظنها متعة، وليس هدف الرواية المتعة".

إن الأستاذ نذير أحمد يحث الناس على التمسك بالدين، ويسمح لهم بسعة القلب في بعض الأمور الفرعية، ليكون إصلاح المجتمع على أتم صورة، وإن الأستاذ نذير ليس روائي زمانه بل إن رواياته بعد مضي قرن ونصف لاتزال خصبة ومفيدة ونافعة.

القصة في اللغة الأردية

سجاد أحمد الندوي (بتنه، ولاية بهار)

بدأت القصة في اللغة الأردية بمساعي كلية فورت وليم فظهر على مسرح الأدب كتاب "باغ و بهار"، إن كتب القصة وإن كانت موجودة من قبل مثل "چهار درويش"، لكن "باغ وبهار" حاز ثقة الناس، ويقال: إن الأستاذ نذير أحمد قد بدأ فن القصة في صورة الرواية، وإن أول رواية له لتعليم الأطفال الخلق النبيل هو مرآة العروس، وقام بتوسعة نطاقها الأستاذ راشد الخيري، وقد ذكر قضايا المرأة في رواياته، فكان همه الوحيد إصلاح وتربية النساء، وقد كتب عدة كتب في هذاالموضوع.

كان من أهداف القصة في أول الأمر المتعة، ولم تكن قضايا الإنسان فيها كما توجد الآن، لكن لما تعقدت الحياة وا زدحمت مشاكلها، تغيرت أساليب القصة، إن العصر الحديث عرف القصة معتنية بقضايا الحياة ،لأنه يتميز عن غيره من العصور بالقلق والاضطراب، والظلم والعدوان، والقتل والإغارة، وانتهاك حقوق الإنسان وسخرية عواطفه، فإن هذه الأحوال بمر بها الإنسان، وكل إنسان يتكلم بلسانه و يستمع إليها، لكنه لا يحمل قدرة التعبير عنها بأحسن وجه، فإن هذه القصص والحكايات حينما تقدم بأسلوب شيق فتأخذ بمجامع القلوب.

إن فن القصة قد عرف على مداره الحكايات والروايات والقصص القصيرة ، لكن أكثرها قبولاً و ذيوعاً القصص القصيرة وبدأت فيها الحداثة والطرافة، فانخدع المبتكرون باسم القصة ومثلوا أعمالاً محيرة، إن هذه الكتابات صارت لغزاً من الألغاز. إن فن القصة قديم جداً، لكنه أحرز القبول في لباس الجدة واستحكم إلى حد كبير، كما كان الإنسان مضطرا إليه، وقت الضرورة، كذلك ازدادت حاجته إليها. ☆☆☆

فن القصة القصيرة في الأدب الاسلامي: قضايا و حلول

الشاه محمد أجمل فاروق الندوي (دهلي)

قال الأديب الكبير عبد الماجد الدريا بادي : " الرواية اسم عبارة عن التصوير الحكائي للحياة الممكنة " ولا شك أنه نوع مرهف ومقبول في النثر ، فكما أن اللغة الأردية قد مرت بمراحل مختلفة من التجريدية والرمزية والتطورية والحداثة والما بعد الطبيعة كذلك الرواية مرت بمختلف النظرات والأفكار ، وقد ألقى كل من له سهم في هذا المجال دلوه ، وأخذ نصيبه ، فكانت الرواية ذريعة مؤثرة لنشر الأفكار والآراء، إن تاريخ القصة القصيرة الذي يشتمل على مأة سنة يدل على أنها لم تتقيد بأ ي فكر خاص ، فانها تسع جميع الأفكار والآراء ، حتى انها تصلح لموافقة كل زمن من الأزمان .

إن الأدب الاسلامي قد عمت فكرته ، وصارت حركته عالمية رغم كثير من العراقيل والعوائق ، لكن كما يقول الدكتور ابن فريد :" لكنها لم تقدم حتى الآن ثروة كثيرة في فن القصة القصيرة "إنها قد قدمت ذخائر كثيرة في الأدب غير الروائي، لكن هذا الجانب لم يخل تماما ، بل هناك عدد من الأدباء مثل الشيخ سيد أسعد الجيلاني ، وماهر القادري وابن فريد ومائل الخير آبادي و م نسيم ، وعائشة الصديقي وسلمة ياسمين و هاجرة مسرور في اللغة الأردية . فهؤلاء كلهم أسهموا في توسعة نطاق الحكاية و القصة القصيرةوالروا ية ، لكن الحاجة إلى ذلك لاتزال باقية . لعل هناك دواعي ألجأت الى التقصير في هذا الجانب :

١- كيفية الاستفادة من القصة القصيرة لأوربا. لأن القصة القصيرة باللغة الأردية قد بلغت إلى أوجها من الاستفادة منها ، فماذا يجب على كتاب القصص القصيرة ؟

٢- إن الأدب الإسلامي أدب بناء وهادف، وهدف القصة القصيرة المتعة ، فهذه المرحلة ذات حساسية أن كيف يمكن في القصة القصيرة إيجاد غرض نبيل؟ وهذا يتطلب جهداً بالغاً .

٣- لم تكن عند الأدب الإسلامي قصص قصيرة إسلامية في معنى الكلمة، تكون نموذجية .

هذه هي قضايا أساسية . فلا بد من تعيين قواعد وضوابط .